سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

سوالات وجوابات

مقابلہ معارفِ قرآن

(۱۵ ۱۴ھ - ۱۶ ۱۴ھ)

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

70

حسن علی بک ڈپو
بڑا امام بارگاہ کھارادر
کراچی پوسٹ کوڈ 74000 فون: 2433055
E-mail: hassanalibookdepot@yahoo.com

વકફ

આ કિતાબ હાજી મહંમદઅલી ભાઈ અલીભાઈ સુંદરજી ''સોમાસોક'' તનનારીવ માડાગાસ્કરવાળા તરફથી તેમના મરહુમ સગાવહાલાઓની રૂહોના સવાબ અર્થે વકફ કરવામાં આવેલ છે.

લાભ લેનાર ભાઈ - બહેનો મરહુમોની અરવાહોના સવાબ અર્થે એક સુરએ ફાતેહા પઢી બક્ષી આપે એવી નમ્ર અરજ છે.

بسم الله الرحمن الرحيم

سوالات وجوابات

مقابلہ معارفِ قرآن

(۱۴۱۵ھ - ۱۴۱۶ھ)

تالیف

سید علی شرف الدین موسوی

یکے از مطبوعات

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲ - بے - ۵/۴ ـــ ناظم آباد ـــ نمبر ۲ ـــ کراچی

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ---------- سوالات و جوابات مقابلہ معارفِ قرآن
تالیف ---------- سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی
کمپوزنگ ---------- مظفر حسین شاداب
ناشر ---------- دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان
تاریخ اشاعت ---------- ذیقعد ۱۴۱۷ھ - اپریل ۱۹۹۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

قرآنی معارف سے آشنائی اور پھر ان پر گفتگو ہم جیسے انسانوں کے بس کی بات نہیں جن کی تخلیق میں ہی جہل و نادانی، نسیان و فراموشی کی آمیزش ہے۔ کیونکہ بقول آیاتِ قرآن اس گنجینۂ معارف سے آگہی ہر کسی کو میسّر نہیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔

"اسے ایک پوشیدہ کتاب میں رکھا گیا ہے۔"

(سورۂ واقعہ ۵۶- آیت ۷۸)

"جو لوح محفوظ میں محفوظ کیا گیا ہے۔" (سورۂ بروج ۸۵- آیت ۲۲)

لہٰذا ہم سوائے اس تسلیم و اعتراف کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ بارِالٰہا ! ہم تیرے کلام کے معارف و مفاہیم کی گہرائیاں جاننے سے قاصر ہیں، ہمارا طائرِ فکر ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔

پھر بارِالٰہا تو نے اسے مس کرنے، چھونے کے لئے طہارت شرط قرار دی ہے۔

"اسے پاک و پاکیزہ افراد کے سوا کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔"

(سورۂ واقعہ ۵۶- آیت ۷۹)

اگر یہ طہارت، غسل یا وضو کے ذریعے حاصل ہو سکتی تو شاید ہمارے لئے اس کا حصول مشکل نہ ہوتا، لیکن یہ طہارتِ ظاہری تو صرف قرآنی حروف کو چھونا جائز کرتی ہے۔ اس کے حقائق و دقائق تک رسائی کے لئے تو فکری اور قلبی طہارت شرط ہے۔ جس سے ہم اپنے آپ کو تہی دست سمجھتے ہیں۔

لیکن آخر وہ کیا وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم اپنے جہل اور کوتاہیوں کے باوجود اس موضوع پر گفتگو اور تحریر کی جسارت کرتے ہیں۔ وہ کچھ اور نہیں آیاتِ قرآنی ہی ہیں۔ وہ ایک طرف تو یہ کہہ کر ہماری ہمت بندھاتی ہیں کہ :

"الر - یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔" (سورۂ یوسف ۱۲- آیت ۱)

"الر - یہ آیات ہیں کتابِ الٰہی اور اس قرآن کی جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتا ہے۔" (سورۂ حجر ۱۵- آیت ۱)

"طس - یہ آیات ہیں قرآن اور اس کتاب کی جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔" (سورۂ نمل ۲۷- آیت ۱)

ہاں ہاں آگے بڑھو، اس قرآنِ کریم کو ہم نے تمہارے سمجھنے کے لئے آسان بنایا ہے۔

پھر بکثرت آیاتِ قرآنی میں ہمیں ان پر غور و فکر کی تاکید بھی کی جا رہی ہے۔

دوسری طرف رسولِ مقبولؐ کی اس شکایت سے بھی خوف آتا ہے جو آنحضرتؐ اس کتاب سے اپنی امت کی بے اعتنائی کے بارے میں روزِ قیامت بارگاہِ الٰہی میں کریں گے کہ :

"میری قوم نے اس قرآن کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔"

(سورۂ فرقان ۲۵- آیت ۳۰)

جن کی شفاعت پر ہم آس لگائے بیٹھے ہیں، اگر وہی ہماری شکایت فرمائیں تو اس سے بڑی روسیاہی اور سیہ بختی کیا ہو سکتی ہے۔

مذکورہ گفتگو سے واضح ہے کہ قرآنی مفاہیم سے ناآشنائی، ان کے حصول کے سلسلے میں سستی و کوتاہی اور قرآن سے دوری و اجنبیت نہ صرف کسی طور جائز نہیں بلکہ باعثِ عذاب اور ناقابلِ بخشش ہے۔

قرآن ہی تمام علوم و دانش کا سرچشمہ ہے، قرآنِ کریم سے روگردانی کرنے والے یا اس کی مخالفت پر کمر کسنے والے کا علم و دانش بے معنی ہے، خواہ وہ کتنا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہو، علوم و سائنس میں کتنی ہی مہارت کیوں نہ رکھتا ہو وہ جاہل گردانا جائے گا۔

حیاتِ انسانی کے لئے قرآنی تعلیمات کی انتہائی اہمیت، قرآنِ کریم سے بے اعتنائی کے مسئلہ پر رسولِ مقبولؐ کی حساسیت اور ملت کی اس سے کمزور ہوتی ہوئی وابستگی کے پیش نظر دارالثقافۃ الاسلامیہ نے اپنی سرگرمیوں کا ایک حصہ قرآنی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے مخصوص کیا ہوا ہے۔ رمضان ۱۴۰۷ھ میں پہلا سیمینار یوم القرآن منعقد کر کے اس سلسلے میں اولین قدم اٹھایا گیا، آٹھ سال مسلسل اس سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں علماء و دانشوروں کو مختلف موضوعات پر قرآن کی روشنی میں اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی تھی۔

رمضان ۱۴۱۵ھ میں پہلی مرتبہ ملکی سطح پر مقابلۂ معارفِ قرآن کا انعقاد کیا گیا تاکہ کراچی شہر کی حدود سے نکل کر ملک کے دور دراز علاقوں کے لوگوں تک

کو قرآنی تعلیمات کی جانب توجہ اور ان کے حصول کی ترغیب دی جائے اور یوں پورے ملک میں قرآن شناسی کی فضا و ماحول پیدا ہو۔

زیرِ نظر کتاب رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ اور ۱۴۱۶ھ کے دو برسوں کے مقابلوں میں پوچھے گئے سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ یہ جوابات ہم نے اپنے فہم و شعور کے مطابق دیئے ہیں۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ صرف یہی جوابات صحیح اور حقیقی ہیں بلکہ انہیں ہم قرآنی مفاہیم کی سمجھ بوجھ کے لئے ایک قدم کی حیثیت دیتے ہیں۔ ہم امیدوار ہیں کہ ہمارے ملک میں ایسے ادارے اور افراد سامنے آئیں گے جو کھلے ذہن اور خالص علمی فضا میں قرآنی مفاہیم کو سمجھنے، سمجھانے اور انہیں پھیلانے کی مخلصانہ کوششیں کریں گے۔

مقابلہ معارفِ قرآن، چند گزارشات

ہم نے اس سال (رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ) تیسری مرتبہ مقابلہ معارفِ قرآنی کا اعلان اور اہتمام کیا ہے۔ اپنے محدود وسائل اور ناکافی توانائیوں کی بنا پر کبھی اس سلسلے کی کوئی روئیداد اور جائزہ و نتائج شائع نہیں کئے۔ گو کہ اس مقابلے میں حصہ لینے والوں اور اس کے ناظر افراد کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ہماری تمام تر توجہ مقابلے کے انعقاد، اس کے نتائج کے اعلان اور دوسرے انتظامی امور کو بطریقِ احسن انجام دینے کے لئے کوششوں پر مبذول رہی۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنی کوتاہیوں کا بھی علم ہے اور ہم ان کے تدارک کے لئے کوشاں بھی رہتے ہیں۔

کیونکہ کبھی اس سلسلے کی روئیداد سپردِ قلم کرکے لوگوں کے حوالے نہیں کی

گئی اس لئے بہت سے ذہنوں میں اس بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ لہٰذا ان خدشات کے ازالے کے لئے ہم ان سطور کے ذریعے سب سے پہلے تو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان مقابلوں کے ذریعے ہم کسی قسم کے مالی یا دوسرے دنیاوی مفادات حاصل کرنا نہیں چاہتے، نہ ہی اس مد میں ہمیں کوئی خاص فنڈ میسر ہے جسے صرف کرنا ہم پر لازم ہو۔

ہمارے پیشِ نظر صرف اور صرف قرآنی تعلیمات کے ابلاغ و تشہیر کے لئے اپنے فریضے سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ اسی مقصد و ہدف کو سامنے رکھ کر ہم نے قرآنی مذاکروں اور اس کے بعد ان مقابلوں کے انعقاد کا بیڑہ اٹھایا، ضمنی طور پر ہمارے مدِ نظر مخالفین کی طرف سے شیعوں پر لگائی جانے والی اس تہمت کا ازالہ بھی تھا جس میں ان کا دعویٰ ہے کہ شیعوں کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں، یہ اس قرآن کو نہیں مانتے، ان کا قرآن عام مسلمانوں کے قرآن سے مختلف ہے، وغیرہ وغیرہ----

ہم تقریباً ۱۰ ہزار کی تعداد میں ملک بھر میں یہ سوالات تقسیم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد اس مقابلے میں شامل ہوں، سوالات کے جوابات دیں اور قرآنِ کریم سے ان کے انس اور ان کی معرفت میں اضافہ ہو لیکن اس حوالے سے صورتِ حال اتنی خوش کُن نہیں، شاید اس کی وجہ ان کی نظر میں سوالوں کا مشکل ہونا ہو لیکن پھر بھی ہم ان سے یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اگر آپ کو مقابلے میں کامیابی کا امکان نظر نہیں آتا (حالانکہ اس نیت سے مقابلے میں حصہ لینا ہماری نظر میں محلِ نظر ہے، ہم اسے مثالی صورت نہیں سمجھتے) تب بھی آپ ہماری طرف سے کئے گئے سوالات کے

جوابات جاننے کی کوشش کیجئے۔ اس بارے میں موجود کتب کا مطالعہ کیجئے، علماء کرام سے رجوع کیجئے تاکہ اس کتاب کی حیات بخش تعلیمات سے آپ کی آگہی میں مزید اضافہ ہو، معاشرے میں قرآن فہمی، قرآن شناسی سے دلچسپی کی فضا پیدا ہو اور ان تعلیمات کا چرچا ہو جو یہ کتابِ ہدایت انسانی سعادت کے لئے فراہم کرتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب جو پہلے دو مقابلہ معارف قرآن کے سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے قرآنی تعلیمات کی تفہیم و تفسیر اور قرآنی معلومات کی تشہیر کے سلسلے میں ایک چھوٹا سا قدم ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں قرآن کے خدمت گاروں میں شمار فرمائے اور ہم روزِ قیامت ان لوگوں میں شامل نہ ہوں، جن کی قرآن سے بے اعتنائی کا اس روز رسولِ اسلامؐ بارگاہِ احدیت میں شکوہ کریں گے۔

علی شرف الدین موسوی

سوالات و جوابات

مقابلہ معارفِ قرآن ۱۴۱۵ھ

سوال نمبرا : قرآنِ کریم ایک مقام پر اہلِ ایمان کو کفار سے مقابلے کے لئے طاقت و قدرت کے حصول کی ترغیب دیتا ہے اور دوسری جگہ اسی کتابِ ہدایت میں مسلمانوں کو کم تعداد کے باوجود کثیر دشمن پر فتح کی نوید دی گئی ہے۔

بتایئے کہ ان دونوں آیات سے کیا نتیجہ اخذ کیا جائے؟ کیا کوئی آیت اس بات کی وضاحت پر مشتمل ہے؟ حوالہ دیجئے۔

جواب : سورۂ انفال کی آیت نمبر۶۰ میں مومنین کو کفار سے مقابلے کے لئے ہر قسم کی طاقت و قدرت کے حصول کی ترغیب دی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

"اور تم سب ان کے مقابلے کے لئے امکان بھر قوت اور گھوڑوں کی صف بندی کا انتظام کرو۔"

قوت اور قدرت کی ایک قسم افراد کی کثرت ہے۔ یعنی مقابلے کے میدان میں جس فریق کی تعداد زیادہ ہوگی وہ زیادہ قوی سمجھا جائے گا چنانچہ اس کی کامیابی کا امکان بھی زیادہ ہوگا۔ لہٰذا کفار و مشرکین سے مقابلے اور ان پر اپنی ہیبت

طاری رکھنے کے لئے مومنین کو ہمیشہ قوت اور قدرت سے لیس ہونا چاہئے۔

لیکن سورۂ بقرہ کی آیت نمبر۲۴۹ میں کم تعداد مومنین کو کثیر تعداد کفار پر فتح کی نوید دی گئی ہے۔ ارشادِ ربّ العزت ہے۔

"اکثر چھوٹے چھوٹے گروہ بڑی بڑی جماعتوں پر حکمِ خدا سے غالب آجاتے ہیں۔"

مذکورہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ استثنائی صورتوں میں کمزور اور کم تعداد فریق، طاقتور اور کثیر فریق پر فتحیاب ہوجاتا ہے۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اجتماعی اور تکوینی امور استثنیٰ پذیر نہیں ہوتے۔ لہٰذا آیت کے مضمون اور خارجی حقائق میں تضاد محسوس ہوتا ہے۔

اس تضاد کو سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر۱۳۹ حل کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اگر کوئی قوم ایمان کے ہتھیار سے لیس ہو تو پھر بڑے سے بڑے دشمن کے سامنے بھی وہ زیر نہیں ہوتی اور سربلندی و سرفرازی اس کا مقدر ہوجاتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

"خبردار سستی نہ کرنا، مصائب پر محزون نہ ہونا۔ اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے۔"

یوں نتیجہ نکلتا ہے کہ کثرتِ تعداد کے علاوہ بھی ایک قوت ہے اور وہ قوتِ ایمانی ہے اور جس قوم کے پاس یہ قوت موجود ہو وہ کثیر دشمن پر بھی غالب آنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

لہٰذا مجموعی طور پر آیات قوت و قدرت کے حصول ہی کی ترغیب پر مشتمل ہیں، ایک آیت مادّی قوت و طاقت کے حصول پر زور دے رہی ہے اور دوسری

آیت میں قوتِ ایمانی کے حصول پر اُبھارا گیا ہے اور یہ ایسی قوت ہے جس کا مشاہدہ چشمِ سر سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ لڑنے والے مجاہدین میں ایسی قوت بھر دیتی ہے جس کے بل بوتے پر ایک ایک مومن دسیوں بلکہ سیکڑوں کفار پر حاوی ہو جاتا ہے۔

❁

سوال نمبر۲ : قرآنِ کریم اولی الامر کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔ مگر کس اولی الامر کی؟

(الف) - غیر مشروط طور پر ہر اولی الامر کی۔

(ب) - عادل اولی الامر کی۔

(ج) - معصوم اولی الامر کی۔

آیات کا حوالہ دے کر جواب دیجئے۔

جواب : ارشادِ الٰہی ہے :

"ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو' رسول اور اولی الامر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں۔" (سورۂ نساء۴۔ آیت۵۹)

مفسرین اور علمائے علمِ کلام دونوں ہی نے اس آیتِ کریمہ پر بحث و گفتگو کی ہے۔ علمائے تفسیر کہتے ہیں کہ اس آیت میں "اطیعوااللہ و اطیعوا الرسول" کے فوراً بعد اولی الامر کا لفظ استعمال کر کے اولی الامر کی اطاعت کو بھی رسول کی اطاعت میں شامل کیا گیا ہے۔ یعنی "اطیعوا الرسول" کے بعد "اطیعوا اولی الامر" نہیں کہا گیا بلکہ "اطیعوا الرسول" کے فوراً بعد "اولی الامر" کا لفظ آیا ہے۔ اور کیونکہ اطاعتِ خدا اور اطاعتِ

رسول میں کسی قسم کی قید و شرط نہیں لگائی گئی' نیز اولی الامر کی اطاعت کو بھی خدا اور رسول کی اطاعت جیسا ہی قرار دیا گیا ہے' اس میں بھی کسی شرط کا ذکر نہیں کیا گیا' لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اولی الامر صرف معصوم ہی ہو سکتا ہے' کیونکہ غیر مشروط اطاعت صرف معصوم ہی کی جائز ہے۔

علمائے علمِ کلام بھی جب یہ بحث کرتے ہیں کہ امامؑ کو معصوم ہونا چاہئے تو وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

بعض لوگ صرف ائمہ اثنا عشر ہی کو اولی الامر قرار دیتے ہوئے فقط معصوم ہی کو اولی الامر سمجھتے ہیں۔ اور اس کے لئے ائمہ کے اس قول کو بنیاد بناتے ہیں جو انہوں نے بارہا اور جا بجا فرمایا ہے۔ "وہ جھوٹ بولتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اولی الامر ہیں۔ بلکہ اولی الامر تو صرف ہم (ائمہ معصومینؑ) ہیں۔"

لہٰذا اکثر و بیشتر علماء نے معصوم اولی الامر کی اطاعت ہی کو واجب قرار دیا ہے۔ لیکن اگر ہم مذکورہ بالا آیت کے سیاق و سباق' مزاجِ قرآن اور خارجی حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر جائزہ لیں تو استفادہ ہوتا ہے کہ وہ اولی الامر جس کی اطاعت واجب ہے معصوم بھی ہو سکتا ہے اور عادل بھی۔ ہم اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے علمائے علمِ اصول کے بیان کردہ تین مفروضے پیش کرتے ہیں جو وہ واجب الاطاعت اولی الامر کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) لا بشرط' یعنی غیر مشروط اولی الامر' (۲) بشرط لا' یعنی بعض صفات کا نہ رکھنے والا اولی الامر' (۳) بشرط شئی' یعنی بعض صفات کا حامل اولی الامر۔

اب ان تین مفروضوں کا ذرا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) - لا بشرط : اس مفروضے کے قائلین اولی الامر کے لئے کسی قید و شرط

کے قائل نہیں، جو بھی کرسیٔ اقتدار سنبھالے یہ لوگ اسی کی پیروی کو واجب قرار دیتے ہیں۔ اس مفروضے کا غیر عقلی، غیر شرعی اور باطل ہونا پہلی نگاہ میں ہی ظاہر ہے کیونکہ مسلمان ہونے کی صورت میں اولی الامر کا کم از کم مسلمان، صاحبِ کردار، مشرع ہونے کا قائل تو ہونا ہی پڑے گا۔

(۲) - بشرط لا : اس مفروضے کے قائلین کے مطابق اگر اولی الامر میں بعض معین صفات جیسے فسق، ظلم، کفر وغیرہ نہ پائی جائیں تو وہ قابلِ اطاعت ہے اور اس کی یہ اطاعت واجب ہے۔ متعدد آیاتِ قرآن ان منفی خصوصیات کے ذکر پر مشتمل ہیں جو اولی الامر میں نہیں پائی جانی چاہئیں۔ مثلاً سورہ کہف کی آیت ۲۸، سورہ احزاب کی آیت ۴۸، سورہ قلم کی آیت ۸ تا ۱۳ وغیرہ۔ (اس بارے میں تفصیلی مطالعے کے لئے سوال نمبر ۸ کا جواب ملاحظہ فرمایئے)

(۳) - بشرط شئی : یعنی بعض شرائط و صفات کے ساتھ۔ لہٰذا اولی الامر میں علم، عصمت اور عدالت جیسی صفات کا پایا جانا ضروری ہے۔

مذکورہ گفتگو میں ہم نے ان آیات کی نشاندہی بھی کی جو یہ بیان کرتی ہیں کہ ان خصوصیات کے حامل لوگوں کی اطاعت ممنوع ہے اور اس طرح اولی الامر کے بارے میں ان لوگوں کا نظریہ باطل ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بغیر کسی قید و شرط کے ہر تخت نشین کی اطاعت واجب و لازم ہے۔ ان لوگوں کا یہ استدلال بھی سراسر لغو ہے کہ آیت میں کیونکہ کسی شرط کا ذکر نہیں اس لئے ہر اولی الامر کی اطاعت واجب کی گئی ہے۔ اس لئے کہ ضروری نہیں کہ شرط کا ذکر بھی اس آیت میں ہو جس میں اطاعت کے وجوب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور قرآنِ کریم کی دوسری آیات اولی الامر کی شرائط کا ذکر کرتی ہیں۔

اسی طرح جو لوگ اولی الامر کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کے ہم ردیف قرار دیتے ہوئے اس کی عصمت کے قائل ہیں اور جن کا کہنا ہے کہ صرف معصوم ہی اولی الامر ہو سکتا ہے، ان کا یہ عقیدہ بھی درست نہیں۔ ہمارے اس مدعا کی دلیل خود اسی آیت کا ذیل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔

"---- پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو، اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو۔" (سورہ نساء ۴- آیت ۵۹)

یہاں آیت میں واضح طور پر کہا جا رہا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو اس کے حل کے لئے قرآن و سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کرو اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اولی الامر کا منصب صرف معصوم سے مختص نہیں بلکہ غیر معصوم بھی اولی الامر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ منصب صرف معصوم کے لئے مخصوص ہوتا تو پھر یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ اختلاف کی صورت میں قرآن اور سنتِ پیغمبرؐ سے رجوع کرو، اس لئے کہ معصوم اولی الامر تو خود قرآن و سنت کی مانند کسوٹی ہے۔

نیز یہ کہنا کہ اولی الامر صرف معصوم ہی ہو سکتا ہے خارجی حقائق سے بھی مزاحم ہے۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم کی رو سے صرف شرعی اور اسلامی حکومت قابلِ قبول ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نظامِ حکومت جائز نہیں اور حکومت ایک ایسی ضرورت ہے جس سے مفر ممکن نہیں، اگر کسی انتہائی چھوٹے سے خطے میں بھی انسان زندگی بسر کرتے ہیں تو وہاں بھی حکومت کا وجود لازم ہے۔ جب حکومت لازم ہے تو سربراہِ حکومت اور اولی الامر بھی ضروری ہے۔ اب غیبتِ

امام زمانؑ میں جب کہ معصوم اولی الامر پردۂ غیب میں ہے یا تو یہ کہا جائے کہ شریعت معطل ہے' لادینی قوانین پر مبنی حکومت جائز ہے۔ لیکن ایسا کہنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ اگر اسلامی حکومت کی ضرورت ہمیشہ موجود ہے اور معصوم ہماری دسترس میں نہیں تو اس دور میں لازماً عادل اولی الامر کی اطاعت واجب ہوگی۔ ان حالات میں عادل اولی الامر کی اطاعت کو واجب نہ سمجھنا دراصل اسلامی حکومت کے لزوم کا قائل نہ ہونے کے مترادف ہے۔

چنانچہ اولی الامر کا منصب صرف معصوم کے لئے مختص نہیں بلکہ قرآن و سنت میں مذکور شرائط پر اترنے والا کوئی بھی شخص اس منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔

❁

سوال نمبر ۳ : قرآنِ کریم ان افراد کی مذمت کرتا ہے جو خدا کو چھوڑ کر غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں اور ان کے معبودوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ "مونث" ہیں۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں لوگ جنہیں معبود قرار دیئے ہوئے ہیں ان میں "مذکر" بھی شامل ہیں۔ پھر قرآنِ کریم انہیں کیوں "مونث" کہتا ہے۔ آیت کے حوالے سے جواب دیجئے؟

جواب : مونث کو مونث اس لئے کہتے ہیں کہ کہ وہ "لیس" یعنی اثر قبول کرنے والے ہوتے ہیں' نرم مزاج ہوتے ہیں۔ لہٰذا خداوندِ عالم نے کفار کے معبودوں کے معبود نہ ہونے کی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم جن کی پرستش کرتے ہو وہ معبود بننے کے اہل ہی نہیں کیونکہ وہ مونث ہیں۔ یعنی "لیس" ہیں' اثر قبول کرنے والے ہیں' متاثر ہو جانے والے ہیں۔ اور کائنات کی وہ حقیقت

جو کسی کے زیرِ اثر نہیں آتی' کوئی اس پر موثر نہیں ہوتا' وہ کسی سے متاثر نہیں ہوتی وہ صرف اور صرف خدا ہے۔ حتیٰ اس دنیا میں جن چیزوں کو مذکر کہا جاتا ہے وہ بھی خدا کے مقابلے میں مونث ہیں۔ ارشادِ الٰہی۔

"یہ خدا کو چھوڑ کر بس موشوں کی پرستش کرتے ہیں اور سرکش شیطان کو آواز دیتے ہیں۔" (سورۂ نساء ۴- آیت ۱۱۷)

❁

سوال نمبر ۴ : مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انبیا علیہم السلام غلط بیانی سے کام نہیں لیتے کیونکہ یہ ان کی عصمت کے منافی ہے۔ جب کہ قرآنِ کریم خود حضرت ابراہیمؑ کی جانب بت توڑنے کے ذکر میں (سورۂ انبیاء ۲۱- آیت ۶۲' ۶۳) اور حضرت یوسف کی جانب پیمانے کے بارے میں (سورۂ یوسف ۱۲- آیت ۷۰) جھوٹ کی نسبت دیتا ہے۔

کیا ان انبیاءؑ نے واقعی غلط بیانی سے کام لیا تھا؟ واضح کیجئے۔

جواب : سورۂ انبیاء آیت ۶۲ اور ۶۳ میں ارشادِ الٰہی ہے۔

"پھر ان لوگوں نے ابراہیم سے کہا کہ کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ ان کے بڑے نے کیا ہے تم ان سے دریافت کر کے دیکھو اگر یہ بول سکیں!!۔"

بعض کم فہم لوگ اس آیت کے ذریعہ استدلال کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کی طرف جھوٹ کی نسبت دیتے ہیں۔ جب کہ اس آیت کے ذریعہ کسی بھی طور حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ آپؑ نے قطعی الفاظ میں یہ نہیں کہا تھا کہ ان کے بڑے نے توڑا ہے بلکہ طنزیہ طور پر' مشروط کرتے ہوئے کہا

تھا کہ یہ بت جو ہاتھ پیر تک ہلا نہیں سکتا' اگر بول سکے تو اس سے دریافت کرو اس نے توڑا ہے۔ اور اس طرح یہ جملہ کہہ کر آپؑ نے اپنے آپ کو مشرکین کے شر سے بھی محفوظ کیا اور ان کے بتوں کے بے حیثیت ہونے کا بھی اظہار کیا۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے بارے میں ہے کہ۔

"اس کے بعد جب یوسف نے ان کا سامان تیار کرادیا تو پیمانے کو اپنے بھائی کے سامان میں رکھوا دیا۔ اس کے بعد منادی نے آواز دی کہ قافلے والو تم چور ہو۔ ان لوگوں نے مڑ کر دیکھا اور کہا کہ آخر تمہاری کیا چیز گم ہوگئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بادشاہ کا پیمانہ نہیں مل رہا ہے۔" (سورۂ یوسف ۱۲- آیت ۷۰' ۷۱' ۷۲)

یہاں دراصل حضرت یوسفؑ کے منادی نے علیحدہ علیحدہ باتیں کی ہیں۔ ایک تو اس نے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں سے کہا کہ تم چور ہو اور دوسرے یہ کہا کہ بادشاہ کا پیمانہ گم ہوگیا ہے۔

جہاں تک پیمانے کا تعلق ہے اس کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ گم ہوگیا ہے' یہ نہیں کہا کہ تم نے چوری کرکے اپنے سامان میں رکھ لیا ہے۔

رہی بات برادرانِ یوسف کو چور کہنے کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں "سرقہ" صرف کسی کے سوئے ہوئے یا غیر موجودگی میں اس کی چیز غائب کردینے کو نہیں کہتے۔ بلکہ جامع طور پر کسی کے عالمِ غفلت میں' یا کسی کو غافل کرکے اس سے کوئی چیز ہتھیا لینے کو سرقہ کہتے ہیں۔ یہ عمل اس شخص کی نیند کے عالم میں بھی انجام دیا جاسکتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں بھی' نشہ کی حالت

میں بھی ہوسکتا ہے' اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر بھی اور جھوٹا وعدہ کرکے بھی۔ اور کیونکہ برادرانِ یوسف نے اپنے والد حضرت یعقوب سے جھوٹا وعدہ کرکے حضرت یوسفؑ کو ان سے لیا تھا لہٰذا آیت میں منادی کا اشارہ اسی سرقہ کی طرف ہے۔

❁

سوال نمبر ۵ : قرآنِ کریم کی متعدد آیات (سورۂ بقرہ- آیت ۹۵- ۲۵۴' ۲۶۷' سورۂ منافقون- آیت ۱۰' سورۂ تغابن- آیت ۱۶) میں لوگوں کو انفاق کی دعوت دی گئی ہے۔ ساتھ ہی انفاق کی بہت سی اقسام کا تذکرہ ہوا ہے۔ بتایئے کہ آیاتِ قرآن کون سے انفاق کو سب سے بہتر قرار دیتی ہیں؟

جواب : بہتر و افضل انفاق کے تعین میں انفاق کرنے والے اور اس انفاق سے استفادہ کرنے والے کی خصوصیات' مقاصد اور رجحانات کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ یہاں ہم آیاتِ قرآن کی روشنی میں افضل و بہتر انفاق پیش کرتے ہیں۔

افضل انفاق' انفاق کرنے والے کے حوالے سے

(۱) تنگی اور سختی کی حالت میں انفاق کرنا۔

"اور تم میں سے فتح سے پہلے انفاق کرنے والا اور جہاد کرنے والا اس کے جیسا نہیں ہوسکتا جو فتح کے بعد انفاق اور جہاد کرے۔ پہلے جہاد کرنے والے کا درجہ بہت بلند ہے' اگرچہ خدا نے سب سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔" (سورۂ حدید ۵۷- آیت ۱۰)

(۲) ایسا انفاق جس پر احسان نہ جتایا جائے۔

"جو لوگ راہِ خدا میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد

احسان نہیں جتاتے اور اذیت بھی نہیں دیتے ان کے لئے پروردگار کے یہاں اجر بھی ہے اور نہ کوئی خوف ہے نہ حزن۔ نیک کلام اور مغفرت اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل دکھانے کا سلسلہ بھی ہو۔ خدا سب سے بے نیاز اور بڑا بردبار ہے۔ ایمان والو اپنے صدقات کو منت گزاری اور اذیت سے برباد نہ کرو۔"

(سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۶۲ تا ۲۶۴)

(۳) انفاق سے کوئی دنیاوی مفاد وابستہ نہ ہو۔

"جو لوگ اپنے اموال کو راہِ خدا میں رات میں' دن میں خاموشی سے اور علانیہ خرچ کرتے ہیں ان کے لئے پیشِ پروردگار اجر بھی ہے اور انہیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ حزن۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۷۴)

"ہم صرف اللہ کی مرضی کی خاطر تمہیں کھلاتے ہیں ورنہ نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔" (سورۂ دہر ۷۶- آیت ۹)

(۴) اپنی سب سے پسندیدہ چیز کو انفاق کریں۔

"تم نیکی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے راہِ خدا میں انفاق نہ کرو۔" (سورۂ آلِ عمران ۳- آیت ۹۲)

(۵) انفاق کی ہوئی چیز بذاتِ خود اچھی اور صاف ستھری ہو۔

"اور خبردار انفاق کے ارادے سے خراب مال کو ہاتھ بھی نہ لگانا کہ اگر یہ مال تم کو دیا جائے تو آنکھ بند کئے بغیر چھوؤ گے بھی نہیں۔"

(سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۶۷)

(۶) انفاق کرنے والا خود کو محروم رکھ کر دے۔

"اور اپنی ذات پر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں چاہے انہیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔" (سورۂ حشر ۵۹- آیت ۹)

افضل انفاق' انفاق سے استفادہ کرنے والے کے حوالے سے

(۱) اعزہ و اقربا کی اعانت۔

"پیغمبر یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ راہِ خدا میں کیا خرچ کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ جو بھی خرچ کروگے وہ تمہارے والدین' قرابتدار' ایتامہ' مساکین اور غربت زدہ مسافروں کے لئے ہو گا اور جو بھی کارِ خیر کروگے خدا اسے خوب جانتا ہے۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۱۵)

(۲) عزتِ نفس کا تحفظ کرتے ہوئے بھیک نہ مانگنے والوں کی اعانت۔

"یہ صدقہ ان فقراء کے لئے ہے جو راہِ خدا میں گرفتار ہو گئے ہیں اور کسی طرف جانے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ ناواقف افراد انہیں ان کی حیا و عفت کی بنا پر مالدار سمجھتے ہیں حالانکہ تم آثار سے ان کی غربت کا اندازہ کر سکتے ہو اگرچہ یہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے ہیں اور تم لوگ جو کچھ بھی انفاق کروگے خدا اسے خوب جانتا ہے۔"

(سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۷۳)

❁

سوال نمبر ۶ : ایک آیۂ قرآن میں ہے کہ حق آنے پر باطل مٹ جاتا ہے۔ اس کے برعکس تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یکے بعد دیگرے انبیاءؑ کی آمد کا سلسلہ جاری رہا لیکن باطل اس وقت بھی موجود رہا اور اب بھی ہے' بلکہ اکثر اوقات

اہلِ حق پر غالب ہی رہا ہے' اس نے انہیں طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی ہیں' کبھی شہید کیا ہے اور کبھی روپوشی پر مجبور کیا ہے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر مذکورہ آیہ کریمہ کا کیا مفہوم ہے؟

جواب : مذکورہ بالا مسئلہ میں رائے قائم کرتے ہوئے دراصل حق اور اہلِ حق کو ایک ہی شے شمار کیا گیا ہے' جب کہ یہ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں' ہمیں ان کا جدا جدا حساب کرنا ہوگا۔ حق منطق اور استدلال ہے' حق حکمِ خدا ہے' حق خبرِ الٰہی ہے' حق آیاتِ قرآن ہیں' حق وحی ہے' حق وہ روایات و احادیثِ ائمہؑ ہیں جو معصومینؑ کی زبان سے صادر ہوئیں۔ یہ ہر چیلنج قبول کرکے اسے منہ توڑ جواب دیتا ہے۔ جہاں حق ہوتا ہے وہاں باطل کو جائے پناہ نہیں ملتی۔

لہٰذا قرآنِ کریم پوری دنیا کو چیلنج کرتا ہے کہ اس کے مقابلے پر کوئی کتاب' اس کی منطق کے مقابل کوئی منطق' اس کے احکامات کے مقابل کوئی احکام اور اس کے قوانین کے مقابل کوئی قانون لاؤ تو جانیں۔ اب تک اس کے مقابل آنے والے تمام احکام' قوانین اور نظریات باطل ثابت ہوئے اور آئندہ بھی اسلام فتحیاب و کامران رہے گا۔

باطل ہر دور میں نئے نئے لبادے اوڑھے آتا ہے اور اس قدر شور بپا کرتا ہے کہ لوگوں کو اس پر حق کا گماں ہونے لگتا ہے لیکن جلد ہی حق کی حکمت اور لوگوں کا تجربہ اس کے باطل ہونے کی تصدیق دیتا ہے۔

رسولِ مقبولؐ کی منطق کے مقابلہ پر مشرکینِ قریش (ابوجہل و ابوسفیان) کی منطق نابود ہوگئی۔ بعد میں باطل کی منطق یزید کی صورت میں نمودار ہوئی لیکن امام حسینؑ کی منطقِ حق کے مقابل شکست سے دوچار ہوئی۔ الغرض اسلامی

اصول و احکام کی حقانیت اب بھی مسلّم ہے اور کوئی اس میں ذرّہ برابر بھی ضعف ثابت نہیں کرسکا ہے۔

جہاں تک اہلِ حق کی شکست' روپوشی یا شہادت کی بات ہے تو کیونکہ خارجی دنیا میں فتح و غلبہ کا دارومدار قوت و قدرت پر ہوتا ہے اس لئے جب اہلِ حق کو قوت و قدرت میسر ہوئی تو کامیابی و کامرانی نے ان کے قدم چومے اور جب انہیں ضعف و کمزوری کا سامنا ہوا تو پسپائی پر مجبور ہوئے' کبھی شہادت کے جام سے سیراب ہوئے اور کبھی روپوشی کی اذیت برداشت کی۔ لیکن خداوندِ عالم کا وعدہ ہے کہ وہ بالآخر ایک دن اہلِ حق کو سارے باطل پر غلبہ نصیب فرمائے گا' اور یہ وہ دن ہوگا جب امامِ زمان حضرت حجۃ ابن الحسن المہدیؑ ظہور فرما کر باطل قوتوں کو تہ تیغ کریں گے اور حق کی فتح و کامرانی کا پرچم پورے عالم پر لہرائیں گے۔

❁

سوال نمبر ۷ : ہمارا عقیدہ ہے کہ خاتم الانبیاءؐ شبِ معراج مسجد الحرام سے قابِ قوسین تک گئے جب کہ قرآنِ کریم صرف مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کا ذکر کرتا ہے۔

بتایئے ہمارا مذکورہ عقیدہ کس آیہ قرآن کی رو سے ثابت ہے؟ آیت تحریر کیجئے۔

جواب : سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی ہی آیت میں ارشادِ ربّ العزت ہے۔

"پاک و پاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔"

اس آیہ شریفہ سے آنحضرتؐ کا شبِ معراج مسجد الحرام سے مسجدِ اقصیٰ تک

جاتا پتہ چلتا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرتؐ نے شبِ معراج مسجد الحرام سے سے قابِ قوسین تک سفر کیا۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ سورۂ نجم کی اس آیت سے ثابت ہے جس میں ارشادِ الٰہی ہے۔

"ماکذب الفواد مارای افتمٰرونه علیٰ مایریٰ ولقد راه نزلة اخریٰ عند سدرة المنتهیٰ عندها جنة الماویٰ"

"تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟ اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہیٰ سے واپسی پر اس کو اترتے دیکھا۔ جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔" (سورۂ نجم ۵۳- آیت ۱۱ تا ۱۵)

مذکورہ بالا آیت پیغمبرِ اسلامؐ کی معراجِ آسمانی کی گواہ ہے۔ ان آیات میں اس مقام پر کہ "سدرۃ المنتہی سے واپسی پر اس کو اترتے دیکھا" مفسرین میں اختلاف ہے بعض اس اترنے والے کو خدا کہتے ہیں یعنی پیغمبرؐ نے خدا کا نظارہ کیا اور بعض کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ نے یہاں جبرئیل کو اپنی اصلی صورت میں دیکھا۔

غرض پیغمبرؐ اترتے ہوئے سدرۃ المنتہی سے گزرے اور اس سے آپؐ کی معراجِ آسمانی ثابت ہے۔

*

سوال نمبر ۸ : قرآنِ کریم کی کن آیات میں حاکمِ اسلامی کی اطاعت کو واجب قرار دیا گیا ہے اور حاکم میں کن صفات کے ہونے پر اس کی اطاعت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ آیات پیش کیجئے؟

جواب : سورۂ نساء کی آیت ۱۵۹ میں حاکمِ اسلامی کی اطاعت کا ذکر ہوا ہے۔

"ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو، رسول اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو۔"

آیاتِ قرآن کی رو سے اگر حاکم میں درجِ ذیل بُرائیاں ہوں تو اس کی اطاعت حرام ہے۔

(۱) یادِ خدا سے غافل ہونا۔

"اور ہرگز اس کی اطاعت نہ کرنا جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے محروم کردیا ہے۔" (سورۂ کہف ۱۸- آیت ۲۸)

(۲) کافر ہونا۔

"لہٰذا آپ کافروں کی اطاعت نہ کریں اور ان سے آخر دم تک جہاد کریں۔" (سورۂ فرقان ۲۵- آیت ۵۲)

(۳) منافق ہونا۔

"اور خبردار کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجئے گا۔"

(سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۱)

"اور خبردار کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کیجئے گا۔"

(سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۴۸)

(۴) جھوٹا ہونا۔

"لہٰذا آپ جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کریں۔"

(سورۂ قلم ۶۸ - آیت ۸)

(۵) عاصی اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہونا۔

"اور کسی گناہگار یا کافر کی اطاعت نہ کریں۔" (سورۂ انسان ۷۶-

آیت ۲۴)

❁

سوال نمبر۹ : ارشادِ ربانی ہے کہ "جو لوگ آیاتِ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں ان کے دلوں میں میل ہے۔" بتایئے آیاتِ متشابہات کی کیا پہچان ہے؟

جواب : قرآنِ کریم کے فہم و ادراک کے حوالے سے سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت میں آیاتِ قرآن کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

"اس نے آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جس میں سے کچھ آیتیں محکم اور واضح ہیں جو اصل کتاب ہے اور کچھ متشابہ ہیں۔ اب جن کے دلوں میں کجی ہے وہ انہی متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور من مانی تاویلیں کریں۔" (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۷)

آیاتِ متشابہات بھی ایک ہی قسم کی نہیں، بلکہ ان کی بھی متعدد اقسام ہیں، ان کی پہچان کے لئے مندرجہ ذیل نکات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) - وہ آیات متشابہ ہیں جن کے الفاظ کے اہلِ لغت کے نزدیک کوئی معنی نہ ہوں۔ اس حوالے سے حروفِ مقطعات بھی متشابہ ہیں۔ کیونکہ اہلِ لغت کے نزدیک ان کے کوئی معنی نہیں۔

(۲) - بعض آیات اعراب و حرکات کی وجہ سے متشابہ ہیں۔ جیسے حیض کے موقع والی آیت (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۲۲) جس میں واضح نہیں کہ یہ فعل مضاعف ہے یا نہیں۔

(۳) - بعض آیات اس بناء پر متشابہ ہیں کہ ان میں استعمال ہونے والے الفاظ کثیر المعنی ہیں اور یہ واضح نہیں ہوپاتا کہ آیت میں کون سے معنی مراد ہیں۔

(۴) - بعض مرتبہ آیت میں استعمال ہونے والے الفاظ کسی خارجی مفروضے کی بنا پر متشابہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے جب سورج اور چاند کو دیکھ کر کہا کہ میں مریض ہوں جب کہ وہ مریض نہ تھے۔ کیونکہ ہم حضرت ابراہیمؑ کو معصوم سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے اس لئے آیت میں موجود لفظ "سقیم" کے معنی متشابہ ہوجاتے ہیں۔ (سورہ صافات ۳۷۔ آیت ۸۹)

(۵) - بسااوقات لفظ واضح ہوتا ہے، متشابہ نہیں ہوتا لیکن جس سے اسے نسبت دی جارہی ہوتی ہے اس کے ساتھ نسبت عقلی طور پر محال نظر آتی ہے۔ جیسے اس آیت میں جس میں خدا کے عرش پر بیٹھے ہونے کا ذکر ہے لفظ "استوی" کو خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے، جب کہ اس صورت میں خدا کا جسم و جسمانیت کا مالک ہونا ثابت ہوتا ہے جو درست نہیں۔ اس لئے عقلی طور پر آیت متشابہ ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیات کن لوگوں کے لئے متشابہ ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں بھی نکتہ وار عرض ہے۔

(۱) - اَن پڑھ اور جاہل لوگوں کے لئے تمام آیات متشابہ ہیں۔

(۲) - انبیاءؑ اور ائمہؑ کے لئے کوئی آیت بھی متشابہ نہیں۔

(۳) - انبیاءؑ اور ائمہؑ کے علاوہ افراد میں سے بعض کے لئے کچھ آیات متشابہ ہوتی ہیں اور بعض دوسروں کے لئے کچھ دوسری آیات۔

❁

سوال نمبر۱۰ : سورۂ مطففین کی ابتدائی آیات میں اس چیز کا نام جس میں

انسانوں کے اعمال پیش کئے جائیں گے "سجین" بتایا گیا ہے۔ "سجین" کے معنی لکھی ہوئی کتاب کے ہیں۔ کیا آیت میں بھی مراد لکھی ہوئی کتاب ہی ہے؟

جواب : آیۂ قرآن ہے۔

"جس دن سب ربّ العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ یاد رکھو کہ بدکاروں کا نامۂ اعمال سجین میں ہوگا اور تم کیا جانو سجین کیا ہے۔ ایک لکھا ہوا دفتر ہے۔" (سورۂ مطففین ۸۳۔ آیت ۶ تا ۹)

سجین فاجر و بدکار انسانوں کے نامۂ اعمال کا نام ہے اور جہنم کا ایندھن بھی دراصل انسان کے یہی اعمالِ بد ہوں گے۔

❁

سوال نمبر ۱۱ : قرآنِ کریم اپنی توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ "متقین کی ہدایت کرتا ہے۔" سوال یہ ہے کہ اگر کوئی کافر ہدایت کا طلبگار ہو تو کہاں رجوع کرے؟ واضح کیجئے۔

جواب : تقویٰ کا پہلا مرحلہ تقویٰ فکری ہے۔ لہٰذا ایسا کافر جو اخلاص کے ساتھ حقیقت کی جستجو میں ہو وہ بھی دراصل اس پہلو سے متقی کہلائے جانے کے قابل ہے۔ ایسا انسان جو ہمیشہ حق کی تلاش میں ہو اور جہاں کہیں اسے حق و حقیقت نظر آئے وہ اسے بغیر کسی ہچکچاہٹ، ضد اور ہٹ دھرمی کے قبول کرلے فکری تقویٰ کا حامل کہلائے گا۔ آیت میں بھی ایسے ہی متقی مراد ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ جو فریقِ مخالف کی بات سننے پر تیار نہ ہوں، جیسے صدرِ اسلام کے کفار و

مشرکین جو آنحضرتؐ کی گفتگو اور کلام سننے سے بچنے کے لئے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیا کرتے تھے یا روئی رکھ لیتے تھے (سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۵) اور آج کے دور کے بھی بعض گمراہ فرقے جو اپنے ماننے والوں کو دوسروں کے عقائد جاننے اور ان کی گفتگو سننے سے منع کرتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی ہدایت نہیں پاسکتے۔

❁

سوال نمبر ۱۲ : قرآنِ کریم صریح الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ مقامِ نبوت و امامت کسی گناہگار کو نہ مل سکے گا، جب کہ ایک آیت پیغمبرِ اسلامؐ سے کہتی ہے کہ "---- تاکہ خدا آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہوں کو بخش دے۔" (سورۂ فتح ۴۸۔ آیت ۲) اس آیت میں پیغمبرؐ کے گزشتہ اور آئندہ گناہوں سے کیا مراد ہے؟

جواب : مذکورہ آیت میں "ذنب" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا عام طور پر اردو میں ترجمہ گناہ کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں "ذنب" سے مراد خداوندِ عالم کی مخالفت و نافرمانی میں صادر ہونے والے گناہ نہیں، بلکہ نبیؐ کے وہ اعمال و افکار مراد ہیں جو کفار و مشرکین کی نظر میں ناپسندیدہ تھے۔

راغبِ اصفہانی کے بقول "ذنب" ہر وہ فعل ہے جس کا انجام بُرا ہو۔ لہٰذا ایسے افعال جن کا انجام روزِ قیامت بُرا برآمد ہوگا یقیناً وہ خداوندِ عالم کی نافرمانی اور مخالفت میں صادر ہونے والے گناہ ہوں گے اور نبیؐ سے ایسے اعمال کا صدور ممکن نہیں۔ ہاں ! پیغمبرؐ سے ایسے اعمال لازماً صادر ہوتے تھے جو کفار و مشرکین کی نظر میں معیوب اور ناپسندیدہ تھے اور یوں آنحضرتؐ ان کی نظر میں گناہ گار اور

مجرم تھے۔ وہ ان گناہوں پر پیغمبرؐ کو سزا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن فتح مکہ کے نتیجے میں مشرکین و کفار مغلوب ہوئے اور خدا نے پیغمبرؐ کو ان عواقب و انجامِ بد سے جو آپؐ کو کفار و مشرکین کے خلاف آپؐ کی گزشتہ اور آئندہ سرگرمیوں سے لاحق ہونے والے تھے محفوظ کردیا۔ آیت میں اسی "ذنب" کی جانب اشارہ ہے' خدا کی نافرمانی میں صادر ہونے والے گناہ مراد نہیں ہیں۔

❁

سوال نمبر۱۳ : جنگِ بدر میں خدا نے مسلمانوں کی مدد کے لئے پانچ ہزار فرشتے بھیجے' (ملاحظہ ہو سورۂ انفال۸- آیت۹' سورۂ آلِ عمران۳- آیت۱۳) ان فرشتوں نے اس جنگ میں کیا کردار ادا کیا؟

جواب : بعض لوگوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ جنگِ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لئے نازل ہونے والے فرشتوں نے باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا' جب کہ حقیقت یہ نہیں۔ کیونکہ اگر فرشتے براہِ راست جنگ میں حصہ لیتے تو۔

(الف) اصحابِ بدر کی کوئی فضیلت نہ ہوتی۔ کیونکہ اصل کارنامہ تو فرشتوں کا ہوتا۔

(ب) تاریخ میں جنگِ بدر میں قتل ہونے والے مشرکین کی تعداد اور ان کو قتل کرنے والے مسلمانوں کے نام بھی ثبت ہیں۔ اگر فرشتے براہِ راست جنگ میں حصہ لے رہے ہوتے تو مشرکوں کو قتل کرنے والے مسلمانوں کے نام مبہم رہتے جب کہ اس وقت وہ واضح ہیں اور لوگ ان سب کو پہچانتے تھے۔

(ج) فرشتوں کا براہِ راست جنگ میں حصہ لینا خداوندِ عالم کی سنّت اور رسم کے خلاف ہے۔ اگر خداوندِ عالم حق و باطل کی معرکہ آرائی میں اس طرح براہِ

راست دخیل ہو تو پھر جنگ و جہاد اور مجاہدین کی کوئی فضیلت نہ رہے۔

اس جنگ میں فرشتوں نے جو کردار ادا کیا اس کی دو صورتیں تھیں۔

(۱) خداوندِ عالم نے مسلمانوں کو فرشتوں کے نزول کی خبر دے کر ان کے حوصلوں کو بلند کیا۔

(۲) اور دوسرے یہ کہ مشرکین کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد کم دکھائی۔ (سورۂ انفال۸- آیت۴۴)

❁

سوال نمبر۱۴ : قرآنِ کریم کی بعض آیات بیان کرتی ہیں کہ کچھ اقوام نے اپنے پیغمبروں کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ "تم تو ہم جیسے بشر ہو۔" خدا نے ان لوگوں کے اس اعتراض کا کیا جواب دیا؟ آیت کا حوالہ بھی دیجئے۔

جواب : سورۂ ہود میں مذکور ہے۔

"انہوں نے کہا کہ ہم تو تم کو اپنے ہی جیسا ایک انسان سمجھ رہے ہیں۔" (سورۂ ہود۱۱- آیت۲۷)

ایک اور مقام پر ہے۔

"ان لوگوں نے جواب دیا کہ تم سب بھی ہمارے ہی جیسے بشر ہو۔" (سورۂ ابراہیم۱۴- آیت۱۰)

نیز سورۂ انبیاء۲۱- آیت۳' سورۂ مومنون۲۳- آیت۲۴ اور ۴۷' سورۂ شعراء۲۶- آیت ۱۵۴ اور ۱۸۶' سورۂ یٰسین۳۶- آیت۱۵' سورۂ تغابن۶۴- آیت۶ ملاحظہ ہو۔

کفار و مشرکین کے اس اعتراض کو انبیاء نے یہ کہہ کر مسترد نہیں کیا کہ

نہیں ہم بشر نہیں' بلکہ کہا کہ ہاں ! ہم تمہاری ہی طرح کے بشر ہیں' تمہاری ہی طرح زندگی بسر کرتے ہیں' ہماری بھی وہی احتیاجات ہیں جو تمہاری ہیں لیکن ہمارا امتیاز یہ ہے کہ ہم صاحبِ وحی ہیں' ہم پر جبرئیلِ امین نازل ہو کر پیغامِ الٰہی پہنچاتے ہیں۔ خداوندِ عالم نے انبیاء سے کہا کہ۔

"آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں مگر میری طرف وحی آتی ہے۔" (سورۂ کہف ۱۸- آیت ۱۱۰)

پھر یہ کہ انسان کی ہدایت کے لئے انسان ہی کو مبعوث ہونا چاہئے۔ لہٰذا ارشادِ ربانی ہے۔

"اگر ہم فرشتے کو پیغمبر بناتے تو اسے بھی آدمی ہی کی صورت میں بھیجتے اور وہی لباس پہناتے جو آدمی پہنتے ہیں۔" (سورۂ انعام ۶- آیت ۹)

❁

سوال نمبر ۱۵ : قرآنِ کریم کی تعریف میں ارشادِ الٰہی ہے کہ "اس میں ہر خشک و تر کا ذکر موجود ہے" جب کہ قرآن ہی کی ایک آیت انبیاء کے تذکروں کے بارے میں یہ کہتی ہے کہ "من لم نقصص علیک" یعنی "اور (قرآن میں) بعض کا تذکرہ بھی نہیں کیا ہے۔" (سورۂ غافر ۴۰- آیت ۷۸)

ان دونوں آیات کو کس طرح حل کریں گے؟

جواب : اس سوال کا جواب یوں ہے کہ "اس (قرآن) میں ہر خشک و تر کا ذکر موجود ہے" سے مراد یہ نہیں کہ یہ کتاب ایک دائرۃ المعارف (Encyclopedia) ہے جس میں ہر بات کا ذکر موجود ہے' ہر شے کے بارے میں معلومات پائی جاتی ہیں' نام بنام ہر چیز کا ذکر ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کتابِ ہدایت میں انسان کی

فلاح و صلاح اور سعادت و کامرانی کے تمام رموز پوشیدہ ہیں' کامیابی و سرفرازی کی ہر ہدایت اس میں موجود ہے۔

❁

سوال نمبر ۱۶ : قرآنِ کریم کی ایک آیت میں ہے کہ "نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔" بتایئے عام حالت میں شراب کی حرمت کس آیت سے ثابت ہے؟

جواب : ارشادِ الٰہی ہے۔

"ایمان والو خبردار نشہ کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جانا۔"

(سورۂ نساء ۴- آیت ۴۳)

ہر انسان دوسروں کے کلام کو اپنی فہم و بصیرت کے مطابق سمجھتا ہے' بعض لوگوں کو کوئی بات سمجھانے کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور بعض لوگ انتہائی صاف الفاظ میں وضاحت کے باوجود مسئلہ کی تہہ تک نہیں پہنچتے۔ علماء اور صاحبانِ فہم و بصیرت کے نزدیک مذکورہ بالا آیۂ کریمہ جو نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کر رہی ہے اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ خداوندِ عالم نشہ کو ناپسند کرتا ہے اور اسی سے وہ یہ درک کر لیتے ہیں کہ خدا نشہ آور چیزوں کے استعمال کو ممنوع قرار دیتا ہے۔

جو لوگ اس آیۂ کریمہ کے ذریعہ نشہ کی حرمت تک نہیں پہنچ پاتے خداوندِ عالم ان کے لئے ایک درجہ اور بڑھ کر شراب کے نقصانات بیان کرتے ہوئے اس کے استعمال سے منع کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔

"یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑی خرابی ہے اور بہت سے فائدے بھی ہیں

لیکن ان کی خرابیاں فائدے سے کہیں زیادہ ہیں۔"

(سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۱۹)

لہٰذا مسلّمہ اصول ہے کہ کم فائدے کے لئے زیادہ نقصانات کو برداشت کرنا حماقت میں شمار ہوگا اور کوئی معمولی عقل و شعور رکھنے والا فرد بھی کم فائدے کے لئے زیادہ نقصان کو برداشت نہ کرے گا۔

لیکن ایسے کوڑھ مغز افراد جن کے نزدیک ان آیات سے شراب کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی انہیں درجِ ذیل آیت صریح الفاظ میں شراب سے منع کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"ایمان والو! شراب، جوا، بت، پانسہ یہ سب گندے شیطانی اعمال ہیں لہٰذا ان سے پرہیز کرو تاکہ کامیابی حاصل کرو۔"

(سورۂ مائدہ ۵- آیت ۹۰)

چنانچہ آخر الذکر آیت صریح الفاظ میں شراب کی ممانعت پر مشتمل ہے۔

❁

سوال نمبر ۱۷ : سود کو ممنوع قرار دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ اسے دوگنا اور چوگنا وصول نہ کرو۔ برابر یا برابر سے کم سود وصول کرنا کس آیت میں حرام قرار دیا گیا ہے؟

جواب : ارشادِ الٰہی ہے۔

"اے ایمان والو! یہ دوگنا چوگنا سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو کہ شاید نجات پاجاؤ۔" (سورۂ آل عمران ۳- آیت ۱۳۰)

کیونکہ نزولِ آیت کے زمانے میں کاروباری معاملات میں سود بُری طرح سے

رائج تھا لہٰذا یہاں بھی حرمتِ خمر (شراب) کی مانند خداوندِ عالم نے تدریج کا اصول اختیار کیا اور ابتدائی طور پر اس عمل کو ناانصافی پر مبنی قرار دیا۔ لیکن ایک دوسری آیتِ کریمہ میں لوگوں کو یوں مخاطب کیا کہ۔

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ روزِ قیامت اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ اس لئے کہ انہوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ تجارت بھی سود جیسی ہے جب کہ خدا نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۷۵)

ایک اور آیۂ کریمہ میں انتہائی سخت الفاظ میں سود کی ممانعت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ۔

"پس راہِ خدا سے روکنے کی بنا پر اور سود لینے کی بنا پر جس سے انہیں روکا گیا تھا اور ناجائز طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کی بنا پر۔ اور ہم نے کافروں کے لئے بڑا دردناک عذاب مہیا کیا ہے۔"

(سورۂ نساء ۴- آیت ۱۶۰-۱۶۱)

❁

سوال نمبر ۱۸ : علمائے عقائد اثباتِ وجودِ خدا کے دلائل میں سے ایک دلیل، دلیلِ فطرت بھی پیش کرتے ہیں۔ بتایئے انسان میں خدا جوئی کی یہ حس کس آیتِ قرآن سے ثابت ہے؟

جواب : انسان میں خدا جوئی کی حس کا فطری ہونا سورۂ عنکبوت کی آیت نمبر ۶۵ سے ثابت ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

"پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو ایمان و عقیدے کے

پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں۔ پھر جب وہ نجات دے کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو فوراً شرک اختیار کر لیتے ہیں۔"

اس آیت میں کشتی کی مثال دے کر بتایا گیا ہے کہ جب انسان پر تمام مادّی دروازے بند ہو جاتے ہیں، تمام مادّی قوتیں اسے بے بس نظر آتی ہیں اور وہ خود کو لاچارگی کے ساتھ خطرے سے دوچار دیکھتا ہے تو اس میں خدا شناسی کی فطری حس بیدار ہو جاتی ہے اور وہ دل کی گہرائیوں سے خدا کو پکارتا ہے لیکن جوں ہی ساحل پر پہنچتا ہے اور زمین پر اس کے قدم پڑتے ہیں اور مادّی سہاروں سے اس کا رشتہ قائم ہوتا ہے وہ فوراً پھر مشرک بن جاتا ہے۔

❁

سوال نمبر۱۹ : قرآن کی بعض آیات کہتی ہیں کہ جب انسان کو کوئی خطرہ آگھیرتا ہے تو وہ مدد کے واسطے خدا کو پکارتا ہے اور یوں خدا کی طرف متوجہ ہونے کو وجودِ خدا پر دلیلِ فطرت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کیا یہ بات دین مخالف عناصر کے اس اعتراض کو تقویت نہیں پہنچاتی کہ دین اور خدا پرستی انسان میں پائے جانے والے خوف کی پیداوار ہے؟ واضح کیجئے۔

جواب : خطرے کے موقع پر انسان کا خدا کی طرف متوجہ ہونا دراصل ایک مستقل اور صاحبِ قدرت ہستی کی جانب متوجہ ہونا ہے۔

انسان مشکلات کے حل کے لئے وسائل و ذرائع سے مدد لیتا ہے۔ اگر ایک ذریعے و وسیلے کو اختیار کرنے کے بعد مشکلات رفع نہ ہوں تو اس سے دوسرے بہتر وسیلے یا ذریعے سے متصل ہوتا ہے۔ پھر جب تمام مادّی ذرائع و وسائل سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس ماوراء مادّہ اور صاحبِ قدرت ہستی کی جانب متوجہ ہوتا

ہے جو چشمِ سر سے تو نظر نہیں آتی لیکن جس کے ہونے کی گواہی اس کی فطرت دیتی ہے۔

یوں انسان کا ذاتِ احدیت کی جانب متوجہ ہونا اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ جن مادّی سہاروں کی طرف اس نے ابتداء میں ہاتھ بڑھایا تھا وہ وسیلے تو تھے لیکن اصل مشکل کشا نہ تھے۔ لہٰذا جب وسائل مشکل کے حل میں ناکام نظر آئے تو اس نے اصل ہستی کو دستگیری کے لئے پکارا۔

اس مقدمہ کے بعد یہ بات واضح کرنا چنداں مشکل نہیں کہ وجودِ خدا کا عقیدہ خوف کی پیداوار نہیں بلکہ تمام مادّی سہارے قطع ہو جانے کی وجہ سے انسان پر سے مادّیت کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے اور مادّی پردے ہٹ جاتے ہیں اور اس کی چشمِ دل خدا کی جانب اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

❁

سوال نمبر۲۰ : قرآنِ کریم میں ہے کہ خدا نے آدمؑ، نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمرانؑ کو منتخب کیا ہے۔ بتایئے عمران سے مراد حضرت مریم کے والد ہیں یا حضرت موسیٰ کے، یا حضرت علیؑ کے والد۔ اور یہ بھی بتایئے کہ آلِ نبی ان میں کہاں شامل ہیں؟

جواب : ارشادِ الٰہی ہے۔

"اللہ نے آدم، نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو منتخب کیا ہے۔" (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۳۳)

یہاں عمران سے مراد حضرت مریم کے والد ہیں اور آلِ نبیؐ آلِ ابراہیم میں شامل ہیں۔

سوال نمبر۲۱ : معروف بات یہ ہے کہ سلسلہ نسل بیٹے سے شمار کیا جاتا ہے، کسی کی بیٹی کی اولاد کو اس کی نسل قرار نہیں دیا جاتا۔ یہ نظریہ دور قدیم سے لوگوں میں رائج ہے۔ کیا کوئی آیتِ قرآن اس نظریے کو مسترد کرتی ہے۔ آیہ مباہلہ کے علاوہ کوئی دوسری آیت پیش کیجئے؟

جواب : بیٹی کے ذریعے نسل چلنے کے سلسلے میں دو آیاتِ قرآنی سے استدلال کیا جاتا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے۔

"تمہارے اوپر تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے، تمہاری رضاعی (دودھ شریک) بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں، تمہاری پروردہ وہ عورتیں جو تمہاری آغوش میں ہیں اور ان عورتوں کی اولاد جن سے تم نے دخول کیا ہے، ہاں اگر دخول نہیں کیا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے اور تمہارے فرزندوں کی بیویاں جو فرزند تمہارے صلب سے ہیں اور دو بہنوں کا ایک ساتھ جمع کرنا سب حرام کردیا گیا ہے۔"

(سورۂ نساء۴- آیت ۲۳)

اس آیتِ شریفہ میں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو بھی مرد کے لئے حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس میں بیٹے کی اولاد اور بیٹیوں کی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح وراثت میں بھی بیٹے کی اولاد اور بیٹی کی اولاد میں اسلام کوئی فرق نہیں رکھتا۔ لہٰذا بیٹی سے نسل چلنے کے سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلے میں دوسرا استدلال درجِ ذیل آیت سے کیا جا سکتا ہے۔

"اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق و یعقوب دیئے اور سب کو ہدایت بھی دی اور اس سے پہلے نوح کو ہدایت دی اور پھر ابراہیم کی اولاد میں داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون قرار دیئے اور ہم اسی طرح نیک عمل کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی رکھا۔" (سورۂ انعام۶- آیت ۸۴-۸۵)

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کو بھی حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے قرار دیا ہے جب کہ حضرت عیسیٰؑ حضرت مریمؑ کے فرزند تھے۔ یہ بیٹی سے نسل چلنے کا ایک اور ثبوت ہے۔

❁

سوال نمبر۲۲ : انسانی زندگی کے تقریباً تمام ہی امور ایک دوسرے کی تقلید کرتے ہوئے انجام پاتے ہیں۔ انبیاءؑ و معصومینؑ کے سوا کوئی خواہ کتنا ہی بڑا عالم و دانشور کیوں نہ ہو اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں دوسروں کی تقلید کا محتاج ہوتا ہے۔ اس مسلّمہ حقیقت کے باوجود قرآنِ کریم شدت کے ساتھ تقلید کی مذمت کرتا ہے۔ بلکہ بعض آیات میں تو علماء کی تقلید کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ وجہ بیان کیجئے؟

جواب : تقلید کی مذمت کرتے ہوئے ارشادِ الٰہی ہے۔

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم اس چیز کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ ایسا ہی کریں گے، چاہے ان کے باپ دادا بے عقل ہی رہے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ رہے ہوں۔" (سورۂ بقرہ۲-

آیت ۱۷۰)

دیگر آیاتِ قرآنی جیسے سورۂ مائدہ ۵- آیت ۱۰۴' سورۂ یونس ۱۲- آیت ۷۸' سورۂ لقمان ۳۱- آیت ۲۱' سورۂ زخرف ۴۳- آیت ۲۳ اور ۲۲' سورۂ انبیاء ۲۱- آیت ۵۳ اور ۵۴ میں بھی ان تمام لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو کہتے تھے کہ ہم احکامِ الٰہی کے مقابل اپنے آباؤاجداد کی سیرت پر چلیں گے۔

تقلید کا لفظ "قلادہ" سے ماخوذ ہے۔ قلادہ کسی چیز کو کسی کی گردن میں لٹکانے کو کہتے ہیں۔ اصطلاحاً کسی کے قول یا فعل کو بلاچوں وچرا' بغیر غور و فکر اور بنا کوئی دلیل و منطق طلب کئے قبول کر لینے کو تقلید کہتے ہیں۔

تقلید ایک اجتماعی ضرورت ہونے کے ساتھ ساتھ مذموم عمل بھی ہے۔ اس کی مذمت اس لئے کی جاتی ہے کہ اس کے نتیجے میں فکری جمود و ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔ تقلید انسان کی فکر کو جامد کرتی ہے اور اس کے اندر سے تحقیق و جستجو کا مادہ ختم کر دیتی ہے۔

لیکن تقلید انسان کی اجتماعی حیات کے لئے لازم و ضروری بھی ہے کیونکہ ایک انسان زندگی کے تمام شعبوں میں ماہر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مختلف شعبوں میں مہارت کے لئے علیحدہ علیحدہ انسان درکار ہیں اور ان شعبوں میں رہنمائی کے حصول کے لئے انسان ان ماہرین کی تقلید کا محتاج ہے۔

اس طرح پتہ چلتا ہے کہ تقلید ایک اجتماعی ضرورت ہونے کے ساتھ ساتھ خلافِ اصل بھی ہے۔ چنانچہ جہاں ضرورت خلافِ اصل ہوتی ہے وہاں اس میں محدودیت آجاتی ہے۔ یعنی اس ضرورت کو خاص شرائط کے اندر پورا کیا جاتا ہے۔ تقلید کے لئے ان شرائط کی تعداد دو ہے۔

○ پہلی شرط یہ ہے کہ جس کی تقلید کی جائے وہ عالم ہو۔ جاہل و نادان کی تقلید ناجائز و قابلِ مذمت ہے۔ لہٰذا جب قرآنِ کریم کفار و مشرکین کو اپنے آباواجداد کی تقلید سے منع کرتا ہے تو اس کی وجہ ان کے آباواجداد کا بے شعور اور گمراہ ہونا بتاتا ہے۔

○ دوسری شرط یہ ہے کہ جس کی تقلید کی جائے وہ صالح کردار کا مالک ہو' عادل ہو' عامل شرع ہو۔ اگر یہ دیکھنے میں آئے کہ جو عالم اپنی تقلید کی دعوت دے رہا ہے وہ خلافِ شرع امور کا مرتکب ہے تو ایسے عالم کی تقلید درست نہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم جاہل اور بے عمل دونوں کی تقلید کو مسترد کرتا ہے۔

❁

سوال نمبر ۲۳ : علم' قدرت اور حیات خدا کی صفاتِ ذاتی میں سے ہیں۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے' اس کی قدرت کے بارے میں شک اس کی ذات کے بارے میں شک کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود حضرت یونسؑ کو خدا کے بارے میں شک ہوا۔ (سورۂ انبیاء ۲۱- آیت ۸۷) وجہ بتایئے؟

جواب : حضرت یونسؑ کو خدا کی قدرت کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ ہوا تھا۔ یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۸۷ میں موجود لفظ "نقدر علیہ" کے معنی کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جاتا اور قرآنِ کریم کے ترجمہ کرنے والے بعض حضرات نے بھی اس کے معنی "قدرت نہ رکھنا" ہی کئے ہیں۔ جب کہ قرآنِ کریم اور لغتِ عرب میں "قدر" کا لفظ متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ قرآنِ کریم میں قدر کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

یہاں اس آیت میں "قدر" کا لفظ تنگی کے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی یونس نے خدا کی قدرت کے بارے میں گمان نہیں کیا بلکہ یہ گمان کیا کہ خدا ان پر تنگی نہ کرے گا۔ اور یوں حضرت یونس پر لگایا جانے والا یہ الزام درست نہیں۔

آیئے اب ہم قرآنِ کریم میں قدر کے متعدد معنی پر مشتمل آیات کا حوالہ دیتے ہیں۔

قدر، قدرت کے معنی میں : سورۂ نحل ۱۶- آیت ۷۵، سورۂ مومنون ۲۳- آیت ۱۸۔

قدر، اندازے کے معنی میں : سورۂ حجر ۱۵- آیت ۲۱، سورۂ یٰسین ۳۶- آیت ۳۹، سورۂ فصلت ۴۱- آیت ۱۰، سورۂ قمر ۵۴- آیت ۴۹، سورۂ مرسلت ۷۷- آیت ۲۲۔

قدر، تنگی کے معنی میں : سورۂ رعد ۱۳- آیت ۲۶، سورۂ طلاق ۶۵- آیت ۷، سورۂ فجر ۸۹- آیت ۱۶۔

❁

سوال نمبر ۲۴ : خدا پرستوں اور آسمانی مذاہب کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ خدا پرستی ابتداء ہی سے انسان کی ذات میں موجود ہے اور شرک و بت پرستی کا رجحان اس میں بعد میں پیدا ہوا ہے۔ جب کہ مادّہ پرستوں کا اصرار ہے کہ انسان فطرتاً خدا پرست نہیں ہوتا بلکہ پریشانیاں اور خطرات میں گھر جانے کی وجہ سے اس میں خدا کا تصور ابھرتا ہے۔

خدا پرستوں کے نظریے کے ثبوت میں قرآنی آیات کیا دلیل لاتی ہیں۔ آیت پیش کیجئے؟

جواب : خدا کی جانب رجحان کے فطری ہونے کی دلیل کے طور پر علمائے تفسیر

متعدد آیات پیش کرتے ہیں مثلاً۔

(۱) وہ آیات جن میں قرآنِ کریم کو تذکرہ، یعنی یاددہانی کرانے والا بتایا گیا ہے۔

(۲) وہ آیات جن میں پیغمبر کو مذکر، یعنی یاددہانی کرانے والا بتایا گیا ہے۔

(۳) وہ آیات جن میں خداوندِ عالم بندوں کی نافرمانی اور عصیان کے موقع پر ان کی مذمت کرتے ہوئے انہیں ان کا عہدِ اطاعت یاد دلاتا ہے۔

(۴) وہ آیات جن میں بشر نے خدا سے عہد باندھا ہے۔

(۵) وہ آیات جن میں یہ بات کہی گئی ہے کہ جب انسان مشکلات کا شکار ہوتا ہے تو اسے خدا یاد آتا ہے۔ یعنی جب تمام مادّی سہارے منقطع ہو جاتے ہیں اور نجات کی کوئی مادّی امید نظر نہیں آتی تو ایسے میں وہ خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

آیات کی مذکورہ بالا اقسام میں ایک مشترک بات یہ ہے کہ یہ سب کی سب یاددہانی پر مشتمل ہیں اور یاددہانی ایسے ہی امر کی کرائی جاتی ہے جسے انسان پہلے سے جانتا ہو۔ یا جس حقیقت کو اس کا ذہن فوراً تسلیم کر لیتا ہو۔ دینی تعلیمات میں اس جاننے کو فطرت کہا جاتا ہے، یعنی جن امور پر انسان بغیر کسی مربی، استاد، یا سرپرست کی تلقین کے از خود یقین رکھتا ہو وہ فطری امور کہلاتے ہیں۔

❁

سوال نمبر ۲۵ : کسی حدیث کے کھوٹا کھرا ہونے کی پہچان کی ایک کسوٹی قرآنِ کریم ہے۔ یعنی ایسی حدیث جو کسی آیتِ قرآن سے متصادم ہو وہ جھوٹی ہوگی۔ بتایئے حدیثِ ثقلین قرآن کی کس آیت سے مطابقت رکھتی ہے؟

جواب : پیغمبرِ اسلامؐ حدیثِ ثقلین میں فرماتے ہیں۔

"اے لوگو ! میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم ان سے منسلک رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ ایک کتابِ خدا' دوسرے میرے اہلِ بیتؑ۔"

سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر۱۰۱ کا مفہوم اس حدیث کے عین مطابق ہے۔ جس میں خداوندِ عالم مسلمانوں سے خطاب فرماتا ہے کہ۔

"اور تم لوگ کس طرح کافر ہوجاؤ گے جب کہ تمہارے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت ہورہی ہے اور تمہارے درمیان رسول موجود ہے اور جو خدا سے وابستہ ہوجائے سمجھو کہ اسے سیدھے راستے کی ہدایت کردی گئی۔" (سورۂ آلِ عمران ۳- آیت ۱۰۱)

آیتِ تطہیر (سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۳۳) کی روشنی میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ خود اہلِ بیتؑ میں سے ہیں۔ البتہ آپؐ ان کی زعامت و ریاست کے منصب پر فائز ہیں۔ اگر اہلِ بیتؑ کی اصطلاح کو اہلِ بیتِ محمدؐ یا اہلِ بیتِ نبیؐ کے الفاظ میں استعمال کیا جائے تو پیغمبرِ اسلامؐ ان سے علیحدہ ہوجائیں گے لیکن اگر "اہلِ بیتِ نبوت" کہیں تو پیغمبرؐ ان میں شامل ہوں گے۔

حدیثِ ثقلین میں اہلِ بیتِ نبوت سے وابستگی کا حکم و تاکید کی گئی ہے' اہلِ بیتِ محمدؐ سے نہیں۔ اور یوں سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر۱۰۱ میں مذکور اس بات کا کہ "جب کہ تمہارے درمیان رسول موجود ہیں" اطلاق اہلِ بیتِ نبوت پر ہوتا ہے۔

کسی حدیث کے کھرا اور کھوٹا ہونے کی پہچان کی واحد کسوٹی اسے قرآنِ کریم پر پیش کرنا ہی نہیں بلکہ پیغمبرِ اسلامؐ کی مسلّم الصدور سنت بھی حدیث کی پرکھ کی

کسوٹی ہے اور اس بات کی دلیل متعدد آیاتِ قرآن ہیں۔ مثلاً۔

"مسلمانو ! تم میں سے اس کے لئے رسول کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے جو اللہ اور روزِ آخرت سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہو۔"

(سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۲۱)

"اور جو کچھ بھی رسول تمہیں دے دے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کردے اس سے رک جاؤ۔" (سورۂ حشر ۵۹- آیت ۷)

علاوہ ازایں حدیثِ ثقلین کے پیغمبرِ اسلامؐ کی زبانِ اقدس سے صادر ہونے کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ یہ حدیث آنحضرتؐ سے مروی اور متواتر احادیث میں سے ہے' کسی بھی صورت میں اسے جھٹلانا ممکن نہیں۔

❁

سوال نمبر۲۶ : قرآنِ مجید کی آیات کہتی ہیں کہ اسے سمجھنے کے لئے آسان بنایا گیا ہے۔ جب کہ ایک آیت کہتی ہے کہ اسے "راسخون فی العلم" ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کیا یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد نہیں؟ ان میں کس طرح مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے؟

جواب : قرآنِ مجید کی ان دونوں قسموں کی آیات میں کوئی منافات اور تضاد نہیں۔ کیونکہ "راسخون فی العلم" کے ایک تو لغوی معنی ہیں اور ایک اصطلاحی معنی۔ "راسخون فی العلم" کے اصطلاحی معنی اور اس کا حقیقی مفہوم جاننے کے لئے سوال نمبر۴۷ کو دیکھئے۔ لغوی اعتبار سے "راسخون فی العلم" اسے کہتے ہیں جس کے دل میں علم جذب ہوچکا ہو۔ اگر اس لحاظ

سے دیکھیں تو یقیناً جس شخص کے دل میں علم جذب ہو چکا ہو اس کے لئے آیاتِ قرآن کا فہم آسان ہوگا۔ اگر کوئی شخص ادبِ عربی میں ماہر اور "راسخون فی العلم" ہوگا تو وہ اس لحاظ سے قرآن کو اچھی طرح سمجھ سکے گا۔ کوئی علمِ کلام میں ماہر ہوگا اور "راسخون فی العلم" ہوگا تو وہ قرآن میں بیان عقائدی موضوعات کو بہتر طور پر سمجھ سکے گا اور اسی طرح دیگر شعبہ ہائے علوم میں۔

سوال نمبر ۲۷ : قرآنِ کریم کہتا ہے کہ روزِ قیامت بندوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ بتایئے اعمال کا یہ وزن کس پیمانے سے کیا جائے گا۔ کتبِ آسمانی کے پیمانے سے، ہر دور کی حجّت و امام کے پیمانے سے یا مجتہد کے فتوے کے ذریعہ سے؟

جواب : متعدد آیاتِ قرآنی بتاتی ہیں کہ روزِ قیامت انسانی اعمال کا وزن کیا جائے گا اور نیکی اور بدی کے وزن کے مطابق ہی جزا اور سزا، جنت و نار کا تعین ہوگا۔ اس سلسلے کی چند آیات درجِ ذیل ہیں۔

"آج (قیامت) کے دن اعمال کا وزن ایک برحق شے ہے، پھر جس کے نیک اعمال کا پلہ بھاری ہوگا وہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔"

(سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۸)

"اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو قائم کریں گے اور کسی نفس پر ادنیٰ ظلم نہیں کیا جائے گا اور کسی کا عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہے تو اسے لے آئیں گے۔" (سورۂ انبیاء ۲۱۔ آیت ۴۷)

"پھر جن کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ کامیاب اور نجات پانے والے

ہوں گے اور جن کی نیکیوں کا پلہ ہلکا ہوگا وہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے نفس کو خسارے میں ڈال دیا ہے اور وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔" (سورۂ مومنون ۲۳۔ آیت ۱۰۲، ۱۰۳)

"تو اس دن جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ پسندیدہ عیش میں ہوگا اور جس کا پلہ ہلکا ہوگا اس کا مرکز ہاویہ ہے۔" (سورۂ قارعہ ۱۰۱۔ آیت ۶ تا ۹)

اصل جواب سے پہلے چند ایسے نکات و مفاہیم کی جانب اشارہ کرتے چلیں جو اس سلسلے میں مفید ہیں۔

روزِ قیامت اعمال کے وزن سے متعلق آیات میں "میزان" کا لفظ استعمال ہوا ہے، عربی زبان میں میزان اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی چیز کو ناپا یا تولا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے دنیا میں دو قسم کے پیمانے استعمال ہوتے ہیں ایک پیمانا مادّی اشیاء کی ناپ تول کے لئے اور ایک معنویات کی جانچ پرکھ کے لئے۔ مادّی پیمانے تو یہی عام ترازو اور مختلف قسم کے دوسرے پیمائش کرنے والے آلات ہوتے ہیں اور معنوی پیمانے جیسے ادب کے میدان میں گرامر اور عقلیات اور فلسفے کے میدانوں میں منطق وغیرہ، جن کے ذریعے کسی تحریر کی ادبی قدر و قیمت اور کسی بات کے سقیم یا سلیم ہونے کی پہچان کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ دنیا میں کسی چیز یا مثلاً کسی عمل کے پرکھنے کے لئے بھی مختلف پیمانے ہیں۔ مثلاً۔

اقتصادی پیمانہ : اقتصادی ماہرین ہر عمل کی قدر و قیمت کا تعین اس کے اقتصادی فوائد اور نقصانات سے کرتے ہیں۔

سماجی اور معاشرتی پیمانہ : ماہرینِ سماجیات کے نزدیک ہر وہ عمل جو

معاشرے کے لئے مفید محسوس ہو قدر و قیمت کا حامل ہوتا ہے اور ایسا عمل جس کی معاشرے کے لئے کوئی افادیت نہ ہو ان کی نظر میں لغو اور بے قیمت ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک پیمانہ الٰہی پیمانہ ہے، یعنی ایسے لوگ جو اس پیمانے کے معتقد ہیں ان کے نزدیک صرف وہی عمل گراں قیمت ہے جس کا مقصد خوشنودیٔ خدا کا حصول ہو اور جو صرف رضائے الٰہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے انجام دیا گیا ہو۔

قیامت کے دن انسانی اعمال کے وزن کے بارے میں دو اعتراضات بھی اکثر سننے میں آتے ہیں۔

ایک یہ کہ جب خدا عالمِ مطلق ہے تو لازماً وہ اپنے بندوں کے اعمال سے بھی واقف ہوگا، پھر کیوں اسے روزِ قیامت اعمال نامہ دیکھنے اور اس کا وزن کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، کیا خدا کا روزِ قیامت انسانوں کے اعمال کا وزن کرنا خدا کے عالمِ کُل اور دنیا میں ظاہر ہونے والے ہر عمل کے ناظر ہونے کے عقیدے کے منافی نہیں۔

دوسرے یہ کہ انسان اس دنیا میں جو بھی عمل انجام دیتا ہے وہ نہیں ختم ہو جاتا ہے مادّی حیثیت میں برقرار نہیں رہتا کہ اس کا وزن کیا جا سکے۔ لہٰذا اعمال کے وزن کرنے کا کیا مفہوم ہے؟

خدا کا روزِ قیامت انسانوں کے اعمال کا وزن کرنا جہل کے سبب سے نہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ وہ اعمال کا وزن کر کے ان کے اعمالِ نیک و بد سے آگاہ ہونا چاہتا ہے، بلکہ اس کا سبب عدالت کے اظہار اور اسے لوگوں کے سامنے لانے کی بنا پر ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک کلاس کا مدرّس سال بھر اس کلاس کے طالبِ علموں سے سروکار رکھنے کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک کی تعلیمی

صورتِ حال سے واقف ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود سال کے آخر میں ان کا امتحان لے کر ان کے درجات کا تعین کرتا ہے۔

جہاں تک دوسرے اعتراض کا جواب ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ کائنات میں پائی جانے والی ہر چیز یا تو مادہ ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ انسان دنیا میں جو اعمال انجام دیتا ہے ان کی ایک مادی حیثیت بھی ہوتی ہے۔

جہاں تک روزِ قیامت اعمال کے وزن کی بات ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ قیامت کے دن حقائق کا ظہور ہوگا یعنی ہر ایک کا حقیقی چہرہ سامنے آئے گا۔

قیامت کے دن انسانی اعمال کو تولنے کے سلسلے میں تین مفروضے ہیں۔

ایک یہ کہ : نامۂ اعمال تولے جائیں گے۔

دوسرے یہ کہ : خود انسان کو تولا جائے گا۔

تیسرے یہ کہ : اعمال کا وزن کیا جائے گا۔

لیکن یہ وزن کس چیز سے کیا جائے گا، کتبِ آسمانی کے پیمانے سے، ہر دور کی حجت اور امام کے پیمانے سے یا مجتہد اور مقلد کے ذریعہ سے؟ یہ اس وقت اصل سوال ہے اور اب ہم اسی کا جواب دیتے ہیں۔

اعمال کی جانچ کے دو پیمانے ہیں۔

☆ ایک پیمانہ قوانین اور شریعتِ آسمانی ہے۔ وہ شریعت ہے جو کتب و صحف کی صورت میں انبیاءؑ پر نازل ہوئی۔ انہی قوانین سے موازنہ کر کے انسانی اعمال کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔ جس انسان کے اعمال ان کے موافق ہوں گے اس کا پلڑا بھاری ہوگا اور جس کے ان کے مخالف ہوں گے اس کا پلڑا ہلکا ہوگا۔

☆ دوسرا پیمانہ حجتِ خدا (نبی یا امام) کی اطاعت ہے۔ خدا کے احکام و فرامین ہر فردِ بشر پر نہیں اترتے اور نہ ہی ہر انسان اس قدر عاقل و دانا ہوتا ہے کہ حکمِ خدا کو سمجھ سکے اسی لئے وہ ایک ایسی ہستی کا محتاج ہوتا ہے جس سے انتہائی اعتماد اور اطمینان کے ساتھ شریعتِ الٰہی اور خدائی قوانین اخذ کر سکے۔ وہ ہستی ایسی ہو جو خطا اور لغزش سے پاک ہو۔ تاکہ ایک طرف تو انسان اس کے اعلیٰ کردار کی بنا پر اس کا شیفتہ ہو اور دوسرے اسے یہ یقین ہو کہ اس سے حکمِ خدا پہنچانے میں کوئی غلطی اور کوتاہی سرزد نہیں ہو سکتی۔

حجتِ خدا کی اطاعت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ شریعت صرف عبادات اور رسوم کا نام نہیں بلکہ اس میں پوری زندگی کے لئے ہدایات پائی جاتی ہیں لہٰذا بہت سے احکامات حجتِ خدا اپنی صوابدید پر دیتا ہے جنہیں قبول کرنا انسان کے لئے لازم ہے۔ چنانچہ انبیاء اور ائمہ اطہارؑ بھی میزانِ عمل ہیں۔ لہٰذا انسانوں کے اعمال کا جائزہ حجتِ خدا کی اطاعت و پیروی کے پیمانے سے بھی لیا جائے گا اور جو جس قدر حجتِ خدا کا فرماں بردار ہوگا اس کا پلڑا اتنا ہی بھاری ہوگا۔

❁

سوال نمبر۲۸ : قرآنِ کریم شبِ قدر میں نازل ہوا ہے۔ آیات کی روشنی میں واضح کیجئے کہ۔

(الف) کیا پوری شب وقتِ نزول ہے؟

(ب) یا قرآن شب کے کسی ایک حصے میں نازل ہوا ہے؟

جواب : اس جواب کے سلسلے میں تین نکات پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) جب ہم اس بات کے معتقد ہوں کہ شبِ قدر میں قرآن کا صرف نچوڑ نازل

ہوا ہے تو پھر اس کے نزول کے لئے پوری رات کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ یہ رات کے کسی ایک مختصر حصے ہی میں نازل ہو سکتا ہے۔

(۲) آیت میں ہے "انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر" اس میں "لیلۃ" نکیرہ ہے اور اس طرح یہ رات کے ایک مختصر وقت پر دلالت کرتا ہے۔

(۳) نکیرہ سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ رات کے کسی ایک حصے میں نازل ہوا ہے۔ پہلے، دوسرے یا تیسرے حصے میں۔

❁

سوال نمبر۲۹ : شبِ قدر کی فضیلت کیا صرف اسی بنا پر ہے کہ اس میں قرآن نازل ہوا، یا اس شب کی اہمیت کی کوئی اور وجہ بھی ہے؟ قرآن کی روشنی میں جواب دیجئے۔

جواب : سورۂ "قدر" شبِ قدر کے فضائل و مراتب کے ذکر پر مشتمل ہے۔ نزولِ قرآن کے علاوہ بھی اس شب کی کئی فضیلتیں ہیں جو اس سورے کی روشنی میں درجِ ذیل ہیں۔

(۱) "انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر"

"بے شک ہم نے اسے شبِ قدر میں نازل کیا۔"

اس شب کی بڑی فضیلت نزولِ قرآن ہے۔ اگرچہ اس آیت میں وضاحت کے ساتھ قرآن کا نام نہیں لیا گیا ہے لیکن یہ بات مسلّم الثبوت ہے کہ "انا انزلنٰہ" کی ضمیر قرآن ہی کی طرف لوٹتی ہے اور یہ ابہام قرآن کی عظمت اور اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے چھوڑا گیا ہے۔

(۲) "وما ادراک ما لیلۃ القدر"

"اور آپ کیا جانیں یہ شبِ قدر کیا چیز ہے۔"

(۳) "لیلۃ القدر خیر من الف شھر"

"شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔"

دوسری اور اس تیسری آیت کو ملا کر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شب اس قدر بافضیلت ہے کہ آنحضرتؐ کو بتایا جارہا کہ آپ کو کیا معلوم یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

(۴) "تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر"

"اس میں فرشتے اور روح القدس اذنِ خدا کے ساتھ تمام امور کو لے کر نازل ہوتے ہیں۔"

اس شب کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اس میں فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ روح القدس یعنی فرشتوں کا سربراہ بھی نازل ہوتا ہے اور مفسرین کے بقول سارے سال کے معاملات اور امور اسی شب میں لکھے جاتے ہیں۔

(۵) "سلام ھی حتیٰ مطلع الفجر"

"یہ رات طلوعِ فجر تک سلامتی ہی سلامتی ہے۔"

اس پوری رات میں، اس کے آخری لمحے تک برکتوں اور رحمتوں کا نزول بھی اس کی ایک فضیلت ہے۔

❁

سوال نمبر۳۰ : کیا شبِ قدر کی ماضی کی اہمیت کی وجہ سے یہ رات ہمارے لئے عبادت کی رات ہے یا آج بھی اس کی کوئی اہمیت ہے؟

جواب : شبِ قدر کی فضیلتوں میں سے ایک فضیلت اس شب میں نزولِ قرآن

ہے۔ کیونکہ اس شب میں یہ بافضیلت اور عظیم کتاب نازل ہوئی جو رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لئے کتابِ ہدایت ہے، اس لئے اس شب کو کیونکر فراموش کیا جاسکتا ہے۔ جب تک قرآنِ کریم کی فضیلت و عظمت باقی رہے گی، اس وقت تک اس شب کی فضیلت بھی رہے گی جس میں یہ الٰہی ہدایت نامہ نازل ہوا۔

اس رات کی ایک فضیلت سورۂ قدر کی روشنی میں "تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر" ہے۔ اور اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ "تنزل" فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شبِ قدر کی اہمیت اور فضیلت پیغمبرِ اسلامؐ اور نزولِ قرآن کے زمانے ہی تک محدود نہیں۔ بلکہ یہ ایک مداوم امر ہے، ایسی شب ہے جو ہر سال اپنی فضیلتوں کے ساتھ آتی ہے۔ چنانچہ اس کی اہمیت مستقبل میں بھی برقرار رہنے والی ہے۔

❁

سوال نمبر۳۱ : روایات و تاریخ سے ثابت ہے کہ قرآن کا نزول ۲۳ سال میں مکمل ہوا۔ جب کہ بعض آیاتِ قرآن کا بیان ہے کہ قرآنِ کریم ایک ہی رات میں پورا کا پورا نازل ہوا۔ بتایئے نزولِ قرآن کی مدت کے بارے میں یہ اختلاف کیوں ہے؟

جواب : تاریخ، روایات اور نزولِ شریعت کے تدریجی ہونے کا اصول اس بات کی واضح و روشن دلیل ہے کہ قرآنِ کریم جو ایک کتابِ شریعت ہے یکبارگی نازل نہیں ہوا۔ یوں بھی کوئی قانون، کوئی شریعت دفعتاً اور یکبارگی معاشرے پر لاگو نہیں ہوسکتی بلکہ اس کا نفاذ تدریجی ہوتا ہے۔ لہٰذا عقل و فطرت کا تقاضا ہے

کہ قرآنِ کریم جو احکامِ شریعت پر مبنی ہے، تدریجی طور پر نازل ہوا اور آیاتِ قرآنی اور روایاتِ معصومینؑ بھی اس بات کی شاہد و گواہ ہیں کہ نزولِ قرآن تدریجاً ۲۳ سال کے عرصہ میں مکمل ہوا ہے۔

اس کے برعکس بعض آیاتِ قرآن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم ایک ماہ یا ایک شب میں نازل ہوا ہے۔ جیسے۔

ارشادِ الٰہی ہے۔

"شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن"

"ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔"

(سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۸۵)

"انا انزلنٰه فی لیلة مبارکة انا کنا منذرین"

"ہم نے اس قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا ہے۔"

(سورۂ دخان ۴۴۔ آیت ۳)

"انا انزلنٰه فی لیلة القدر"

"بے شک ہم نے اسے شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔"

(سورۂ قدر ۹۷۔ آیت ۱)

چنانچہ ان آیات کے مطالعے سے یہ تردد پیدا ہوتا ہے کہ اصل بات کیا ہے۔ کیا قرآن تدریجی اور مرحلہ وار نازل ہوا ہے یا اس کا نزول یکبارگی اور دفعتاً ہوا ہے؟ اس بات کی وضاحت کے سلسلے میں ہم آیات و روایات کی روشنی میں نکتہ وار جائزہ لیتے ہیں۔

(الف) : سورۂ ہود کی آیت نمبر ایک میں ہے کہ۔

"الر کتب احکمت آیاته ثم فصلت من لدن حکیم خبیر"

"الر، یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں اور ایک صاحبِ علم و حکمت کی طرف سے تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔"

(ب) : قرآن کے نزول کے بارے میں مادہ نزول دو صیغوں میں آیا ہے۔ ایک "انزال" یعنی "انزلہ" جو یکبارگی اور ایک مرتبہ نزول پر دلالت کرتا ہے۔ دوسرا "تنزیل" (باب تفعیل سے) جو مرحلہ وار نزول پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی قرآن ایک مرتبہ پورا کا پورا، یکبارگی اترا ہے اور ایک مرتبہ ۲۳ سال کی مدت میں رفتہ رفتہ نازل ہوا ہے۔

(ج) روایات و احادیثِ معصومینؑ اور اجماعِ امت قرآن کے تدریجی نزول پر دلالت کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا نکات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآنِ کریم کا نزول تدریجی اور مرحلہ وار بھی ہوا ہے اور یکبارگی اور دفعتاً بھی۔ قرآنِ کریم یکبارگی اور دفعتاً رہبر و رہنما کے لئے نازل ہوا اور اس طرح اسے کلی اصولوں کی تعلیم دی گئی، شریعت کے بنیادی اصول اس کے ذہن میں بٹھائے گئے۔ جب کہ تدریجی نزول امت کے لئے ہوا کیونکہ معاشرہ پوری شریعت کے یکبارگی نفاذ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا فطری انداز میں جوں جوں معاشرے نے تقاضا کیا اور لوگوں کو مسائل درپیش ہوئے ان کے لئے احکامِ الٰہی نازل ہوئے۔ چنانچہ اگر یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ یکبارگی نزول پیغمبرؐ کے لئے ہے اور تدریجی نزول امت کے لئے۔

سوال نمبر۳۲ : قرآنِ کریم کی بعض آیات میں مستضعفین کو زمین پر مقتدر بنانے کی نوید دی گئی ہے۔ جب کہ بعض دوسری آیات میں ان کی مذمت آئی ہے اور انہیں خدا کے قہر و غضب اور جہنم کی وعید دی گئی ہے۔

مستضعفین کے بارے میں ان دو متضاد خبروں کی وضاحت کیجئے؟

جواب : مستضعفین کو زمین پر مقتدر بنانے کی نوید دیتے ہوئے ارشادِ الٰہی ہے۔

"اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کو زمین میں کمزور بنا دیا گیا ہے ان پر احسان کریں اور انہیں لوگوں کا پیشوا بنائیں اور زمین کا وارث قرار دیں۔" (سورۂ قصص ۲۸- آیت ۵)

جب کہ ایک دوسری آیت میں انہیں اہلِ جہنم میں سے قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

"جن لوگوں کو فرشتوں نے اس حال میں اٹھایا کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے تھے۔ ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم زمین میں کمزور بنا دیئے گئے تھے۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم ہجرت کر جاتے۔ ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین منزل ہے۔" (سورۂ نساء ۴- آیت ۹۷)

ان دونوں آیات میں مستضعفین کے بارے میں دو مختلف اور تقریباً متضاد خبروں کی وجہ مستضعفین کی اقسام ہیں۔ یعنی وہ مستضعفین علیحدہ ہیں جنہیں زمین پر اقتدار کی خوش خبری سنائی گئی ہے اور وہ مستضعفین دوسرے ہیں جنہیں اہلِ جہنم قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں قسم

کے مستضعفوں میں فرق یہ ہے کہ ان میں سے ایک وہ ہیں جو اپنے ضعف کی وجہ سے مستکبروں اور ظالموں کے ایجنٹ بن گئے' ان کے خدمت گار ہو گئے اور ان کے ظلم میں برابر کے شریک ہو گئے۔ ان کے بارے میں آیتِ قرآن ہے۔

"یہ کافر کہتے ہیں کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے۔ کاش تم دیکھو ان کا حال اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔ جو لوگ دنیا میں مستضعف تھے وہ مستکبرین سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ مستکبر ان مستضعفوں کو جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی۔ نہیں' بلکہ تم خود مجرم تھے۔ یہ مستضعف ان مستکبروں سے کہیں گے نہیں' بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں۔ آخر کار جب یہ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈالیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلا دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے ویسی ہی وہ جزا پائیں۔"

(سورۂ سبا ۳۴- آیت ۳۰ تا ۳۳)

لہٰذا سورۂ نساء کی آیت ۹۷ میں ایسے ہی مستضعفوں کا ٹھکانہ جہنم بتایا گیا ہے۔

مستضعفین کی دوسری قسم وہ ہے جو ظلم کا مقابلہ کرتے ہیں، استقامت اور پامردی سے ظلم کرنے والوں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں اور جب مقابلے کی طاقت کھودیتے ہیں تو بجائے گھٹنے ٹیکنے اور سرِ تسلیم خم کرنے کے ہجرت کرجاتے ہیں۔ خدا ایسے مستضعفوں کو سراہتا ہے، ان کی تعریف کرتا ہے اور انہیں دنیا و آخرت میں کامیابی کی نوید دیتا ہے۔ جیساکہ سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۹۷ میں ہے کہ۔

"پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے وطن سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور انہوں نے جہاد کیا اور قتل ہوگئے تو میں ان کی برائیوں کی پردہ پوشی کروں گا اور انہیں ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔" (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۹۷)

ایسے مصلح مستضعفین انبیاءؑ و ائمہؑ کی صف میں شمار ہوں گے اور انہی کو دنیا پر اقتدار کی خوشخبری دی گئی ہے۔

✻

سوال نمبر ۳۳ : قرآنِ کریم پیغمبرؐ کے دو بیوت کا ذکر کرتا ہے ایک بیتِ محمدؐ اور دوسرا بیت نبوت۔ بتایئے ان دونوں بیوت کا ذکر قرآن کے کس سورے اور کس آیت میں ہوا ہے اور ان دونوں بیوت کا فرق کیا ہے؟

جواب : قرآنِ کریم میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کے دو بیوت کا ذکر سورۂ احزاب کی دو آیات میں آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"یا نساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبه مرض و

قلن قولا معروفا و قرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الاولیٰ و اقمن الصلاة واتین الزکوٰة واطعن الله ورسوله انما یریدالله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهرکم تطهیرا"

"اے زنانِ پیغمبر تم اگر تقویٰ اختیار کرو تو تمہارا مرتبہ کسی عام عورت جیسا نہیں ہے۔ لہٰذا کسی آدمی سے لگی لپٹی بات نہ کرنا کہ جس کے دل میں بیماری ہو اسے لالچ پیدا ہوجائے اور ہمیشہ نیک باتیں کیا کرو۔ اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور پہلی جاہلیت جیسا بناؤ سنگھار نہ کرو اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور بس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہلِ بیت کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔" (سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۲ اور ۳۳)

پہلی آیت میں ازواجِ نبی کو "وقرن فی بیوتکن" کی تاکید کی گئی ہے، اس میں جس بیت کا ذکر ہے وہ آنحضرتؐ کا گھر ہے، ازواج کا نہیں، اس کے صاحبِ خانہ حضرت محمدؐ ہیں۔ اس گھر میں حضورؐ کی ازواج، اولاد، غلام، متبنیٰ سب رہ سکتے ہیں اور کیونکہ آیت کا لہجہ انہیں تبشیر و انذار کرنے والا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس گھر میں صالح اور پاکباز افراد بھی ہوں گے اور ممکن ہے غیر صالح افراد بھی ہوں۔ لیکن جو آیت "انما یرید الله--- یطهرکم تطهیرا" کے ذریعے آنحضرتؐ کے اہلِ بیت کی پاکیزگی اور عصمت کا ثبوت دیتی ہے وہ اہلِ بیتِ نبوت کے بارے میں ہے اور اس سے مراد حضرت فاطمہؑ اور

وہ معصوم ہستیاں ہیں جو دوام و بقائے نبوت کی ضامن ہیں۔

❁

سوال نمبر۳۴ : قرآنِ کریم کی ایک آیت میں ارشادِ قدرت ہے "اور اس فتنے سے بچو جو صرف ظالمین کو پہنچنے والا نہیں۔" (سورۂ انفال۸- آیت۲۵) جب کہ ایک اور آیتِ قرآن ہے کہ ایک کے گناہ کی سزا دوسرے کو نہیں دی جائے گی۔ (سورۂ انعام۶- آیت۱۶۴) اس تضاد کی کیا وجہ ہے؟

جواب : سورۂ انفال کی آیت۲۵ جو یہ کہہ رہی ہے کہ "اور اس فتنے سے بچو جو صرف ظالموں کو پہنچنے والا نہیں ہے۔" (سورۂ انفال۸- آیت۲۵) یعنی اس فتنے کا شکار بے قصور اور بے جرم و خطا لوگ بھی ہوں گے۔ اس سے مراد دنیا میں ملنے والا وہ عذاب ہے جس میں پورا معاشرہ بلا تفریق مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس عذاب کی لپیٹ میں صالح و پاکدامن افراد بھی آجاتے ہیں۔ کیونکہ مثلاً جب سیاست و قیادت پر بدعنوان عناصر کا کنٹرول ہوجائے تو اس کے نتیجے میں پھوٹنے والا فساد کسی کو بھی نہیں بخشتا بلکہ اکثر مواقع پر پاکباز لوگ ہی سب سے پہلے اس کا نشانہ بنتے ہیں۔

لہٰذا اس فتنے، اس عذاب سے بچنے کے لئے ہر فرد پر لازم ہے کہ جوں ہی اسے فتنے کے آثار نظر آئیں، جوں ہی فتنہ سر اٹھاتا محسوس ہو وہ فوراً اس کی سرکوبی کا ساماں کرے وگرنہ یہ فتنہ بڑھ کر اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے محلے کے ایک گھر میں لگی ہوئی آگ بجھانے کی کوشش نہ کی جائے تو وہ پورے محلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

اجتماعی عذاب بھی اسی صورت سے نازل ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ

معاشرتی خرابیوں، منفی رجحانات اور مفاسد کو دیکھ کر کنارہ کش ہوجاتے ہیں، ان سے بے تعلق رہتے ہیں، ان کی روک تھام کے لئے کوششیں نہیں کرتے، ان کی مذمت نہیں کرتے۔ اس طرح یہ خرابیاں، رجحانات اور مفاسد بڑھتے بڑھتے خود ان کے دروازے تک پہنچ کر انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ان برائیوں کے خلاف زبان نہ کھولنے، مذمت نہ کرنے اور اس طریقے سے بالواسطہ ان کا ساتھ دینے کی وجہ سے یہ لوگ عذابِ آخرت کے بھی مستحق ہوجاتے ہیں اور خدا روزِ قیامت بھی انہیں شدید عذاب میں مبتلا کرے گا۔

ہاں، ممکن ہے بعض ایسے لوگ بھی دنیا میں پھوٹنے والے فتنے اور عذاب کی لپیٹ میں آجائیں جو برائیوں کے خلاف ہوں، ان سے برسرِپیکار ہوں، لیکن ایسے لوگوں کو جہانِ آخرت میں انعام و اکرام سے نوازا جائے گا اور اس دیار میں وہ اجر و ثوابِ الٰہی کے حقدار ہوں گے۔

وہ آیۂ کریمہ جو کہتی ہے کہ "ایک کے کئے کی سزا دوسرے کو نہ ملے گی۔" (سورۂ انعام۶- آیت۱۶۴) وہ صرف آخرت سے مربوط ہے اور وہاں اس قدر دقیق، باریک اور عدل پر مبنی حساب ہوگا کہ جس نے برائی کی ہوگی وہی اس کے انجامِ بد کا مزہ چکھے گا، کسی کو بے جرم و بے خطا سزا نہ ملے گی۔

❁

سوال نمبر۳۵ : قرآن کی ایک آیت سے ظاہر ہے کہ "ہماری اس زمین کے پچاس ہزار سال قیامت کے ایک دن کے مساوی ہیں۔" (سورۂ معارج۷۰- آیت۴) جب کہ ایک اور آیت میں ہے کہ "اس دنیا کے ایک ہزار سال

آخرت کے ایک دن کے برابر ہیں۔" (سورۂ حج ۲۲- آیت ۴۷) ان دونوں آیات میں پائے جانے والے اس فرق کی وضاحت کیجئے؟

جواب : قرآنِ کریم میں "یوم" کا لفظ "لیل" کے مقابل اور ضد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ نیز یوم سے مراد ۲۴ گھنٹے کا مکمل دن لیا جاتا ہے' اس میں دن اور رات دونوں شامل ہیں اور "یوم" کا لفظ مطلق زمانے کے بارے میں بھی استعمال ہوتا ہے' ممکن ہے یہ زمانہ ۲۴ گھنٹے پر مشتمل ہو' ممکن ہے کئی مہینوں' کئی برسوں پر مشتمل۔

یہاں سوال میں دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک دن کئی ہزار برس پر محیط ہو۔ دوسری بات آیات میں پایا جانے والا اختلاف ہے۔ سورۂ حج کی آیت نمبر ۴۷ میں ہے کہ "پروردگار کے نزدیک ایک دن بھی ان کے شمار کے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔" جب کہ سورۂ معارج کی آیت نمبر ۴ میں عالمِ آخرت کے بارے میں ہے کہ "اس ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔"

جدید سائنس اور ماہرینِ فلکیات کی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کسی کُرے کے زمان کا تعین اس کُرے کے اپنے گرد گھومنے کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ کوئی کُرہ اپنے گرد کس رفتار سے اور کتنی بار گھومتا ہے اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی تناسب سے اس کُرے کے دن و سال کا تعین کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارا کُرۂ ارض (زمین) جب اپنے گرد ۳۶۵ چکر مکمل کرتا ہے تو یہ زمین کا ایک سال کہلاتا ہے اور اس کا اپنے گرد ایک چکر ایک دن کہلاتا ہے۔

ممکن ہے ہماری زمین جس مدت میں اپنے گرد ایک چکر مکمل کرتی ہے کوئی

اور کُرہ اسی مدت میں اپنے گرد ۳۶۵ چکر مکمل کرتا ہو۔ اس طرح اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کُرے کا ایک برس ہمارے ایک دن کے برابر ہے۔

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ خداوندِ عالم کے نزدیک جو نظام رائج ہے اس کا ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہے اور خدا نے روزِ قیامت کے لئے جو نظام مقرر کیا ہے اس کا ایک دن ہمارے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔

❁

سوال نمبر ۳۶ : معروف ہے کہ خداوندِ عالم نے سات آسمان اور سات زمینیں خلق کی ہیں۔ سات آسمانوں کا ذکر تو قرآن میں ملتا ہے' سات زمینوں کا ذکر کونسی آیت میں ہوا ہے؟

جواب : سات آسمانوں کا ذکر قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں ملتا ہے۔

"اس کے بعد اس (خدا) نے آسمان کا رخ کیا تو سات مستحکم آسمان بنا دیئے۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۹)

"سات آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷- آیت ۴۴)

"پھر مزید کہئے کہ سات آسماں اور عرشِ اعظم کا مالک کون ہے۔"

(سورۂ مومنون ۲۳- آیت ۸۶)

"اللہ ہی وہ ہے جس نے ساتوں آسمانوں کو پیدا کیا ہے۔"

(سورۂ طلاق ۶۵- آیت ۱۲)

"اسی نے سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کئے ہیں۔"

(سورۂ ملک ۶۷- آیت ۳)

"کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ خدا نے کس طرح تہ بہ تہ سات آسمان بنائے ہیں۔" (سورۂ نوح ۷۱- آیت ۱۵)

سات آسمانوں کے ذکر پر مشتمل آیاتِ قرآنی ہم نے پیش کیں۔ جہاں تک بات رہی سات زمینوں کی تو آیات میں تو اس بارے میں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا لیکن احادیث و روایات اور دعاؤں میں متعدد مقامات پر سات زمینوں کی بات ہوئی ہے۔ البتہ سورۂ طلاق کی آیت ۱۲ میں "ومن الارض مثلھن" سے بعض علماء سات زمینوں پر استدلال کرتے ہیں۔

❁

سوال نمبر ۳۷: قرآنِ کریم میں کُل کتنی مرتبہ علم و معرفت کے حصول کی دعوت دی گئی ہے؟

جواب : قرآنِ کریم میں سات سو بیاسی (۷۸۲) مرتبہ حصولِ علم کی، انتیس (۲۹) مرتبہ حصولِ معرفت کی اور سولہ (۱۶) مرتبہ تعقل و تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔

❁

سوال نمبر ۳۸ : قرآنِ کریم میں مسلمانوں پر کفار کے تسلط کو مسترد کیا گیا ہے۔ یعنی کہا گیا ہے کہ کفار کبھی بھی مسلمانوں پر مسلط نہ ہو سکیں گے۔ بتایئے قرآن میں اس بات کی خبر دی گئی ہے یا یہ حکم کا درجہ رکھتی ہے؟

جواب : اگر تاریخ پر نظر دوڑائیں بلکہ حالیہ صورتِ حال ہی یہ بتاتی ہے کہ کفار مسلمانوں پر مسلط ہیں۔ لہٰذا یہ بات خبر نہیں ہو سکتی کیونکہ الٰہی خبر کبھی جھوٹی

نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ بات ایک حکم ہے جو خبر کی صورت میں دیا گیا ہے۔ یعنی مسلمانوں سے چاہا گیا ہے کہ وہ کبھی کفار کو اپنے اوپر تسلط کی اجازت نہ دیں۔

❁

سوال نمبر ۳۹ : قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں (جیسے سورۂ انعام ۶- آیت ۱۴۹ اور سورۂ قمر ۵۴- آیت ۵) خدا کی حجت کو "حجتِ بالغہ" (یعنی ہر جگہ پہنچنے والی) کہا گیا ہے۔ جب کہ ہمیں نظر آتا ہے کہ دنیا کے بہت سے خطوں میں خدا کی حجت نہیں پہنچی۔ نیز حجتِ خدا خود بہت سے مسلمانوں کے قلوب و اذہان میں بھی رسائی پیدا نہیں کر سکی۔ بتایئے پھر حجتِ بالغہ سے کیا مراد ہے؟

جواب : حجتِ بالغہ کے حوالے سے ہم دو پہلوؤں سے گفتگو کریں گے۔

ایک پہلو خود اصل حجتِ خدا سے مربوط ہے۔ یعنی بذاتِ خود اس میں انسان کو متاثر کرنے اور منوانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ بہت سے افکار و نظریات انسان کو متاثر نہیں کر پاتے، وہ انہیں نہیں مانتا۔ لیکن حجتِ خدا جو اس وقت ہمارے پاس قرآنِ کریم اور سنتِ معصومینؑ کی صورت میں موجود ہے اس میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ نہ ہی اپنے ہدف کے ابلاغ کے سلسلے میں، نہ ہی معنی و مفہوم کے اعتبار سے اور نہ ہی الفاظ و لغات کے اعتبار سے اس میں کوئی نقص پایا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر قرآنِ کریم جن و انس کو چیلنج کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم اس کے مقابلے میں کم از کم ایک ہی سورہ بنا لاؤ۔ یا اس کا یہ کہنا کہ "لا اکراہ فی الدین" بھی خدا کی حجت کے بالغہ ہونے کی سند ہے۔ یعنی صرف لوگوں کے جسم ہی اسے نہیں مانتے بلکہ دین ان کے قلب و ذہن میں پہنچتا ہے۔

پس حجّتِ خدا بالغہ ہے یعنی سب کے لئے قابلِ قبول ہونے کے سلسلے میں کسی ضعف کا شکار نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے کے انسانوں کے لئے یہ قابلِ قبول ہے اور انہوں نے اسے تسلیم کیا ہے۔

اب دنیا کے تمام گوشوں میں اس کا نہ پہنچنا اور دنیا کے ہر ایک انسان کا اسے قبول نہ کرنا اور خود مسلمانوں کے فکر و عمل میں اس کا رسائی نہ پانا' دوسرا پہلو ہے۔ اور یہ اس بنا پر نہیں کہ خدا کی حجت بالغہ نہیں بلکہ اس کا ایک سبب تو وہ رکاوٹیں ہیں جو اس کی رسائی کی راہ میں کفار' منافقین اور ملحدین کھڑی کرتے ہیں۔ جس طرح ابوسفیان پیغمبرِ اسلامؐ اور اہلِ مکہ کے درمیان حائل ہوا۔ مارقین' قاسطین اور ناکثین نے حضرت علیؑ کی ندائے حق کو دبایا اور ان کے بعد کے حکمرانوں نے ائمۂ اطہارؑ کی آواز کو لوگوں تک نہ پہنچنے دیا۔ اور دوسرا سبب معصومینؑ کے بعد آنے والے دینی مبلغین ہیں۔ تبلیغ کے لئے ان کی تربیت نہ ہونے' دنیا سے ڈر کر اس سلسلے میں کوتاہی برتنے' مادیات سے وابستگی اور غیر صالح و نااہل افراد کے منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے حجتِ خدا رسوخ پیدا نہ کر سکی اور جب مسلمانوں کی بڑی تعداد ہی تک نہ پہنچ سکی تو غیر مسلموں اور دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچنا تو دور کی بات ہے۔

❁

سوال نمبر ۴۰ : قرآنِ کریم میں اس کتابِ ہدایت کو فروخت کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔ "فروختِ آیات و کتاب" سے مراد اگر یہی طبع شدہ قرآن ہے جو کتابی صورت میں بازاروں میں دستیاب ہے تو کیا اس کی فروخت قرآنی حکم کی خلاف ورزی نہیں؟ واضح کیجئے۔ نیز قرآنِ کریم میں اس کتاب کی آیات کو کم قیمت پر

فروخت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ کیا آیاتِ قرآن کو زیادہ قیمت پر فروخت کیا جا سکتا ہے؟

جواب : ارشادِ الٰہی ہے۔

"سب سے پہلے کافر نہ بن جاؤ۔ ہماری آیتوں کو معمولی قیمت پر نہ بیچو۔" (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۴۱)

"جو لوگ خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے احکام کو چھپاتے ہیں اور اسے تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں صرف آگ بھر رہے ہیں۔" (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۷۴)

"لیکن انہوں نے اس عہد کو پسِ پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر بیچ دیا تو یہ بہت بُرا سودا کیا ہے۔" (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۸۷)

"اہلِ کتاب میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ پر اور جو کچھ تمہاری طرف نازل ہوا ہے اور جو ان کی طرف نازل ہوا ہے سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں آیاتِ خدا حقیری قیمت پر فروخت نہیں کرتے۔" (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۹۹)

ان آیاتِ مذکورہ میں آیاتِ الٰہی اور کتابِ الٰہی سے مراد مشترکہ طور پر تورات' انجیل' قرآن اور ان کی آیات ہیں۔ نیز یہاں بعض آیات سے مراد وہ آیات ہیں جو تورات و انجیل میں پیغمبرِ اسلامؐ کی بعثت کی بشارت پر مشتمل ہیں' یا وہ آیات ہیں جن میں حرام و حلال کا ذکر ہوا ہے۔

پہلی آیت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ "سب سے پہلے کافر نہ بن جاؤ۔ ہماری آیتوں کو معمولی قیمت پر نہ بیچو۔" (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۴۱) تو جس طرح اس سے

مراد یہ نہیں کہ بعد میں کافر بن جاؤ تو جائز و روا ہے اسی طرح معمولی قیمت پر آیتوں کو بیچنے کا بھی یہ مطلب نہیں کہ زیادہ قیمت پر انہیں فروخت کیا جائے۔

اُس وقت کے علماء اپنے دنیوی مفادات یا ذاتی اغراض کے پیشِ نظر آیاتِ الٰہی کی من مانی اور غلط تفسیر و توجیہ کرکے بندگانِ خدا کو ان کے صحیح معنی و مفہوم سے لاعلم رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کے اس عمل کو "فروختِ آیات و کتاب" سے تعبیر کیا گیا اور اس کی مذمت و ممانعت کی گئی۔ چنانچہ آج بھی اگر کوئی آیاتِ قرآنی کی تفسیر مقتدر قوتوں کی مرضی و منشاء کے مطابق یا اپنے ذاتی مفادات کے لئے کرے تو اس پر بھی قرآن کی اس اصطلاح "فروختِ کتاب" کا اطلاق ہوگا۔

جن آیات میں کم قیمت پر کتابِ خدا کو بیچنے کی مذمت کی گئی ہے ان سے مراد یہ نہیں کہ زیادہ قیمت پر بیچنا پسندیدہ اور احسن ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی کو ایک آیت کی غلط تفسیر کرنے، یا اصل معنی چھپانے کے واسطے پوری دنیا کی پیش کش بھی کی جائے تب بھی یہ اس کے لئے قلیل عوض ہے۔

❁

سوال نمبر۴۱ : مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ روزِ قیامت جنت جانے کے لئے لوگوں کو پُلِ صراط سے گزرنا ہوگا۔ پُلِ صراط کا ذکر قرآن کی کس آیت میں آیا ہے؟

جواب : عربی زبان میں صاف، پختہ اور کھلے راستے کو صراط کہتے ہیں۔ اگر یہ کہیں تو غیر مناسب نہیں کہ کسی بھی مقصد تک رسائی کے لئے صاف ستھرے، مضبوط، ہموار اور چوڑے چکلے راستے کو صراط کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں متعدد تراکیب کے ساتھ یہ لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً صراطِ مستقیم، صراطِ حمید، صراطِ عزیز، صراطِ رب----

قرآنِ کریم میں لفظ صراط ۳۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس کے ہم معنی الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک سبیل ہے جو سورۂ مائدہ کی آیت نمبر۱۶ اور سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر۱۲ میں آیا ہے۔ اسی طرح ایک "طریق" ہے جو سورۂ نساء کی آیت نمبر۱۶۸ اور ۱۶۹ میں ذکر ہوا ہے۔

شرعی اصطلاح میں بندے کے خدا تک پہنچنے کے راستے کو صراط کہا جاتا ہے۔ اس راستے کی مختلف اقسام ہیں لیکن خدا تک پہنچنے کا مستقیم اور سیدھا راستہ سورۂ مومنون کی آیت نمبر۷۳ کی رو سے انبیاء کا بتایا ہوا راستہ ہے۔

جس طرح بندے کے خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے اسی طرح ایسی راہیں بھی ہیں جو لوگوں کو جہنم تک پہنچاتی ہیں۔ سورۂ نساء کی آیت نمبر۱۱۷ میں شرک کو یہ راہ قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر۱۰۸ میں دوسروں کے حقوق پر تجاوز کو جہنم کی راہ بتایا گیا ہے۔ سورۂ ص کی آیت نمبر۲۶ میں خدا کے عصیان اور اس کی نافرمانی کو جہنم کی راہ قرار دیا گیا ہے۔ نیز خدا اور ائمہؑ کے حق میں افراط و تفریط کرنا، طاغوت کا راستہ اختیار کرنا، دنیا طلب کرنا، بغیر غور و تامل کے کسی مذہب کو اختیار کرنا، دوسروں کی خواہش پر اور خوشنودی کے حصول کے لئے اپنا مذہب قربان کرنا، دائیں اور بائیں راہوں پر چلنا، شیطان کے راستے پر چلنا صراطِ منحرف ہے۔ یہ راستے روزِ قیامت جہنم کی سمت لے جائیں گے۔

وہ آیت جس سے پلِ صراط کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے وہ سورۂ مریم کی آیت نمبر۷۱ اور ۷۲ ہے جس میں ارشاد ہے کہ۔

"وان منکم الا واردھا کان علی ربک حتما مقضیا
ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیا"

"تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم پر وارد نہ ہو' یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے۔ پھر ہم ان لوگوں کو بچالیں گے جو (دنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اسی میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔"

اس آیہ مبارکہ میں لفظ "صراط" استعمال نہیں ہوا۔ پھر بھی صراط اخذ کرنا کسی آیت یا روایت سے ثابت نظر نہیں آتا۔

ایسا راستہ جو کسی گڑھے' ندی' نالے یا دریا پر سے گزرتا ہے اسے پُل کہتے ہیں۔ کیونکہ جنت کا راستہ جہنم سے گزر کر جاتا ہے اور جہنم کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایک گڑھا ہے اس قرینے کی بنیاد پر اسے پلِ صراط کہتے ہیں۔ اس پل کا کوئی علیحدہ سے وجود ہے' اس کی کیا شکل و صورت ہے اور یہ کس مواد سے بنا ہے اس بارے میں بھی کوئی واضح بات نہیں ملتی۔ بلکہ آیات و روایات کی رو سے زیادہ قابلِ قبول بات یہ ہے کہ پلِ صراط اسی دنیا میں ہے جس سے انسان کو گزرنا ہے۔ جو کوئی خدا' رسولؐ اور ان کے برحق نائبین کی پیروی کرتے ہوئے اس دنیا کی مشکلات و مصائب کو عبور کرجائے اس کی منزل جنت ہوگی۔ اور اگر کوئی دنیا میں راہِ راست سے بھٹک جائے' دنیا کی آزمائشوں میں اس کے قدم لڑکھڑا جائیں تو اس کی جائے قرار جہنم ہوگی۔

اقوالِ معصومینؑ میں بھی دو صراط کا ذکر ملتا ہے۔

"مفضل کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا۔ صراط کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا : صراط معرفتِ الٰہی کی سمت راستہ ہے اور یہ دو ہیں ایک دنیا میں اور ایک آخرت میں۔ دنیا میں یہ راہ وہ امام ہے

جس کی اطاعت فرض کی گئی ہے اور قرار دیا گیا ہے کہ دنیا کا ہر شخص اسے پہچانے اور اس کی راہ کی پیروی کرے۔ اگر ایسا ہے تو وہ روزِ آخرت جہنم پر موجود پلِ صراط کو عبور کرے گا وگرنہ وہاں اس کے قدم لڑکھڑا جائیں گے اور وہ جہنم میں جا پڑے گا۔"

(بحار الانوار - ج۸ - ص۶۶)

امام حسن عسکریؑ فرماتے ہیں۔

"صراطِ مستقیم دو ہیں ایک دنیا میں اور ایک آخرت میں۔ دنیا میں صراطِ مستقیم یہ ہے کہ انسان افراط و تفریط سے دور رہے اور کسی قسم کی گمراہی اور باطل کی جانب مائل نہ ہو اور آخرت کا صراطِ مستقیم وہ راستہ ہے جو مومنین کو سیدھا بہشت تک لے جاتا ہے اور جہنم یا کسی اور سمت میں ان کی راہ نہیں موڑتا۔" (بحار الانوار ج۸ - ص۸۰)

غرض کسی آیت میں صراحت کے ساتھ پلِ صراط کا ذکر نہیں ملتا۔

❁

سوال نمبر۴۲ : صاحبانِ شعور کہتے ہیں کہ نہ ظلم کرو اور نہ اسے قبول کرو۔ جب کہ قرآن میں ہابیل و قابیل کے بیان میں مذکور ہے کہ ہابیل نے قابیل سے کہا کہ "تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔" (سورۂ مائدہ۵- آیت۲۸) کیا ہابیل کا یہ کہنا ظلم کو قبول کرنے کے مترادف نہیں؟

جواب : سوال میں مذکورہ آیت سے قبل والی آیت میں ہابیل کو متقی کہا گیا ہے اور زیرِ بحث آیت کے آخری حصے میں انہیں عالم قرار دیا گیا ہے کیونکہ آیت میں

ہے کہ "میں عالمین کے پالنے والے خدا سے ڈرتا ہوں۔" جب کہ قرآنِ کریم کے مطابق صرف عالم ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔ جیساکہ ارشادِ الٰہی ہے۔

"اللہ سے ڈرنے والے اس کے بندوں مین صرف صاحبانِ معرفت ہیں۔" (سورۂ فاطر ۳۵۔ آیت ۲۸)

چنانچہ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ہابیل متقی بھی تھے اور فقیہ بھی اور خود یہ دونوں باتیں ان کے عمل کی صحت کی دلیل بن جاتی ہیں۔

بعض مفسرین "ہابیل" کے دفاع سے انکار کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیونکہ دفاع کا حکم اس وقت تک نازل نہ ہوا تھا اس لئے ہابیل نے ایسا کیا۔

اسی کے ساتھ ہابیل کے عمل کے جواز پر ہمارے پاس ایک عقلی دلیل بھی موجود ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اگر قابیل کے حملہ کرنے سے پہلے ہابیل اس پر حملہ آور ہوتے اور اسے قتل کردیتے تو یہ خود ظلم کے زمرے میں آتا' شرعی اصطلاح میں ایسے قتل کو قصاص قبل از جنایت کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب قابیل حملہ کرے تو ہابیل دفاع نہ کریں' مذکورہ آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر تم قتل میں پہل کروگے تو میں قتل میں پہل نہ کروں گا۔ اور اس میں یہ نہیں ہے کہ میں اپنا دفاع نہ کروں گا بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں قتل میں پہل نہ کروں گا۔ اس طرح ہابیل کے یہ کہنے کا مطلب ظلم قبول کرنا نہیں۔

❁

سوال نمبر ۴۳ : نسلِ آدم حضرت آدمؑ کے ذریعے پھیلی ہے۔ کیا نسلِ آدم

حضرت آدمؑ کی اولاد کی حور سے شادی کے ذریعے پھیلی' یا جنیہ سے ازدواج کے ذریعے یا کسی اور مخلوق کے ذریعے یا پھر آپس میں بہن بھائی کی شادی کے ذریعے۔ آیت سے ثابت کیجئے؟

جواب : بدیہی بات ہے کہ حضرت آدم کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے۔ حضرت آدمؑ کے لڑکوں نے جنیہ سے شادی کی' حوریہ سے شادی کی یا کسی اور مخلوق سے رشتہ ازدواج قائم کیا' یہ تینوں باتیں اس آیۂ مبارکہ کے خلاف ہیں جس میں ارشادِ الٰہی ہے کہ۔

"انسانو ! اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کا جوڑا بھی اسی کی جنس سے پیدا کیا ہے اور پھر دونوں سے بکثرت مرد و زن دنیا میں پھیلا دیئے ہیں۔" (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱)

انسانوں کے ایک ہی نفس سے پیدا ہونے کا ذکر سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۸۹ اور سورۂ زمر ۳۹۔ آیت نمبر ۶ میں بھی ہوا ہے۔

دراصل حضرت آدمؑ کی اولاد کی آپس میں شادیوں کے ذریعے ہی نسلِ آدم پروان چڑھی ہے۔ اگر یہ قبول کرلیا جائے کہ حضرت آدمؑ کے لڑکوں کی حوریہ' جنیہ یا کسی اور مخلوق سے شادی کے ذریعے نسلِ آدم بڑھی تو پھر خدا کا یہ دعویٰ غلط ہوجاتا ہے کہ اس نے انسانوں کو نفسِ واحد سے خلق کیا ہے۔ بلکہ اس طرح تو انسان مختلف نفوس کے ملاپ کا نتیجہ قرار پائیں گے۔

اس بات کو کہ حضرت آدمؑ کے لڑکوں کی شادی اپنی بہنوں اور حضرت آدمؑ کی بیٹیوں سے ہوئی بعض علماء کچھ روایات کی بنیاد پر مسترد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بہن اور بھائی کا آپس میں رشتہ ازدواج قائم کرنا درست نہیں۔ لیکن اگر

اس مفروضے کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا جائے اور سوال کیا جائے کہ آخر کیوں بہن بھائی میں رشتۂ ازدواج جائز نہیں۔ کیا بہن اور بھائی میں جنسی تعلق قائم ہی نہیں ہو سکتا؟ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ تاریخ گزشتہ اور دورِ حاضر میں بھی بہن اور بھائی کے درمیان رشتۂ ازدواج کے قیام کے شواہد ملتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر یہ تصور کرلیا جائے کہ حضرت آدمؑ کے لڑکوں نے حور یہ اور جنیہ سے شادی کی تو پھر حضرت آدمؑ کی لڑکیوں کی شادی کس سے ہوئی؟ کیا وہ غیر شادی شدہ ہی دنیا سے اٹھالی گئیں؟ اگر ایسا ہے تو ان کی خلقت کیا عبث نہ تھی اور بے کار خلقت خداوندِ عالم سے محال ہے۔

نیز قابیل اور ہابیل کے درمیان نزع کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے یہاں جڑواں اولادیں پیدا ہوتی تھیں، ان میں سے ایک لڑکی ہوتی اور ایک لڑکا۔ ایک ساتھ پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کی آپس میں شادی نہیں ہوتی تھی بلکہ دوسرے دو بہن بھائی جو ایک ساتھ پیدا ہوتے تھے، اُن میں اور اِن میں رشتۂ ازدواج قائم کیا جاتا تھا۔ قابیل چاہتے تھے کہ جو لڑکی ان کے ساتھ پیدا ہوئی ہے، ہابیل کی اس سے شادی نہ ہو۔

بہرحال اس قصے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے لڑکے اور لڑکی آپس میں شادی کیا کرتے تھے۔

حضرت آدمؑ کی اولاد کی آپس میں شادی کے مخالفین کو ایک اور جواب یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ کیا آپ باپ اور بیٹی کی شادی کو جائز سمجھتے ہیں؟ یقیناً ان کے پہلے استدلال کی رو سے اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہوگا۔ جب کہ نصِ قرآنی کے مطابق اماں حوا حضرت آدمؑ ہی سے پیدا ہوئیں۔ روایات کی رو سے

حضرت آدمؑ کی پسلی سے متولد ہوئیں۔ اور پھر ان دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم ہوا۔

کوئی بھی حکم اس وقت شرعی قرار پاتا ہے جب شارع مقدس اس کا فرمان صادر کرے اور قرانِ کریم سورۂ نساء کی آیت نمبر ۲۳ میں بہن سے شادی کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ ظاہراً اس سے پہلے بہن اور بھائی میں شادی جائز رہی ہوگی۔

اسلام کی جانب سے بہن اور بھائی کی شادی کی حرمت کا فلسفہ ممکن ہے یہ ہو کہ اسلام انسانی رشتوں اور تعلقات کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہے، مزاجِ شریعت یہ ہے کہ اعزہ و اقربا میں رشتہ و تعلق کا بندھن مضبوط سے مضبوط ہو، وہ کوئی ایسی صورت باقی نہیں رکھنا چاہتا جس کی وجہ سے انسانی رشتے کمزور ہوں۔

انسانی رشتے دو قسم کے ہیں ایک اصلی اور ذاتی اور دوسرے مصنوعی و قراردادی۔ اصلی اور ذاتی رشتے خون کے رشتے ہوتے ہیں جیسے بہن بھائی، ماں باپ کا رشتہ جب کہ مصنوعی اور قراردادی رشتہ میاں بیوی کا رشتہ ہے۔ انسان کا والدین اور بہن بھائی سے رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے، ممکن ہے وقتی رنجشیں اسے کمزور کردیں، عارضی طور پر ان میں دوریاں پیدا ہوجائیں۔ لیکن زندگی کے کسی موڑ پر بہرحال ان رنجشوں اور دوریوں کے خاتمے کا امکان ہوتا ہے۔ جبکہ رشتۂ ازدواج اٹوٹ بندھ نہیں۔ یہ مصنوعی اور قراردادی رشتہ ہے۔ ممکن ہے یہ ساری عمر الفت و مودت کے ساتھ برقرار رہے لیکن اگر خدانخواستہ اس میں رخنہ پڑ جائے تو پھر ہمیشہ کی جدائی پر بھی منتہی ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب صحابیٔ رسولؐ زید بن ارقم سے سوال کیا گیا کہ کیا آنحضرتؐ کے اہلِ بیت میں ان کی بیویاں بھی شامل ہیں؟ انہوں نے جواب دیا : نہیں، خدا کی قسم بیوی شوہر

کے ساتھ ایک مدت تک تو ضرور رہتی ہے۔ لیکن اگر مرد اس کو طلاق دے دے تو وہ اپنے ماں باپ اور اپنے قوم و قبیلے میں آجاتی ہے۔ اہلِ بیتؑ تو رسولِ کریمؐ کے وہ خاندان والے ہیں جن پر آنحضرتؐ کے بعد بھی صدقہ حرام ہے۔

لہٰذا شریعت اس اٹوٹ بندھن کو مصنوعی اور قراردادی رشتے میں نہیں بدلنا چاہتی، جو ہمیشہ خطرے کی زد پر رہتا ہے۔ لیکن بہن اور بھائی کے مابین رشتہ ازدواج کے قیام کی ممانعت نسلِ انسانی کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے بعد ہی ممکن تھی۔ اس سے پہلے ممکن اور قابلِ عمل نہ تھی۔

مختصر یہ کہ حضرت آدمؑ کی نسل ان کی اولادوں کی آپس میں شادیوں کے ذریعے بڑھی اور پھیلی اور بہن اور بھائی کے درمیان شادی کی ممانعت کا حکم بعد میں نازل ہوا جب کہ نسلِ آدم خوب پھیل چکی تھی۔

❁

سوال نمبر ۴۴ : بعض آیات میں ارشادِ الٰہی ہے کہ ہمارے قانون میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ جب کہ یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ خدا کی جانب سے نازل ہونے والی ہر نئی شریعت نے پچھلی شریعت کو منسوخ کیا ہے۔ کیا یہ خدا کے قانون میں تغیر نہیں؟ وضاحت کیجئے۔

جواب : ارشادِ الٰہی ہے۔

"سنة من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا"

"یہ ہمارا مستقل طریقِ کار ہے جو ان سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنہیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہمارے طریقِ کار میں

تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷- آیت ۷۷)

ایک اور مقام پر ارشادِ رب العزت ہے۔

"سنة الله فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیلا"

"یہ اللہ کی سنت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔"

(سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۶۲)

"فلن تجد لسنت الله تبدیلا ولن تجد لسنت الله تحویلا"

"یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔"

(سورۂ فاطر ۳۵- آیت ۴۳)

"سنة الله التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیلا"

"یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔" (سورۂ فتح ۴۸- آیت ۲۳)

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی سنتِ الٰہی میں تبدیلی اور تغیر کی سختی کے ساتھ نفی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان آیات میں جس تغیر و تبدل کی نفی کی گئی ہے وہ سنتِ کونی اور سنتِ اجتماعی ہے۔ کہیں بھی شریعت میں ہونے والے تغیر و تبدیلی کی نفی نہیں ہوئی بلکہ بعض آیات گزشتہ شریعتوں کے نسخ ہونے کی گواہ ہیں۔

شریعت کے نسخ ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک احکام کے لحاظ سے اور

دوسرے ہادی اور رہنما کے عنوان سے۔

نسخِ احکام میں کلیات اور امہاتِ فضائل و امہاتِ خبائث نسخ نہیں ہوتے، بلکہ فروعی احکام منسوخ ہوتے ہیں جن میں بسا اوقات وہ احکام ہوتے ہیں جو خداوندِ عالم وقتی طور پر امتوں کی آزمائش و امتحان کی غرض سے ان پر نازل کرتا ہے، جیسے کہ سورۂ مبارکہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۳ میں ہے کہ :

"وما جعلنا القبلة التی کنت علیها الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علیٰ عقبیه"

"پہلے جس طرف تم رخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے۔"

یا کبھی سزا کے طور پر کچھ چیزیں حرام کردیتا ہے۔

"و علی الذین هادوا حرمنا کل ذی ظفر و من البقر والغنم حرمنا علیهم شحومهما الا ما حملت ظهورهما او الحوایا او ما اختلط بعظم ذالک جزینٰهم ببغیهم وانا الصٰدقون"

"اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کردیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے۔"

(سورۂ انعام ۶- آیت ۱۴۶)

اور بعض چیزیں جو گزشتہ شرائع میں حرام تھیں انہیں نئی آنے والی شریعت

حلال کردیتی ہے۔

"ولا حل لکم بعض الذی حرم علیکم و جئتکم بایة من ربکم فاتقوا الله واطیعون"

"اور اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کردوں جو تم پر حرام کردی گئی ہیں۔ دیکھو میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔" (سورۂ آلِ عمران ۳- آیت ۵۰)

چنانچہ اصل محرماتِ شریعت جیسے زنا، شراب، قتل وغیرہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

بشر کی ہدایت کے لئے ہادی اور رہنما بھی بدلتے رہتے ہیں کیونکہ سنتِ کونی ہے کہ ہر انسان کو بالآخر موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ لہٰذا جب کوئی ہادی دنیا سے جاتا ہے تو اس کی ہدایت کا دور بھی ساتھ ہی ختم ہوجاتا ہے اور خدا کسی نئے شخص کو بطورِ ہادی و رہنما کے مقرر کرتا ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی اس ہادی و رہنما کا انکار کرے اور اسے جھٹلائے تو اس کا یہ عمل باطل اور قابلِ مواخذہ و عقاب ہے۔

❁

سوال نمبر ۴۵ : بعض علماء کا کہنا ہے کہ خداوندِ عالم نے تمام انسانوں کو ذرات کی صورت میں آدم کی پشت سے نکال کر ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار اور شرک سے انکار کا وعدہ لیا ہے۔ بتایئے ان علماء کا یہ دعویٰ کس آیتِ قرآن کے مطابق ہے؟

جواب : بعض علماء و مفسرین کے مطابق تمام انسانوں کو آدم کی پشت سے نکال کر خدا کی الوہیت اور شرک سے انکار کا عہد سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ میں ذکر ہوا ہے۔

"اور جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا کہ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" انہوں نے کہا "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔" یہ ہم نے اس لئے کیا کہ کہیں تم روزِ قیامت یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔" یا یہ نہ کہنے لگو کہ شرک کی ابتداء تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے۔"

❁

سوال نمبر ۴۶ : مذکورہ بالا عقیدہ (روزِ الست عہد و پیمان کا عقیدہ) کیا کسی آیت سے متضاد ہے۔ اگر ہے تو اس آیت کا حوالہ دیجئے؟

جواب : یہ عقیدہ کہ "خدا نے تمام انسانوں کو آدم کی پشت سے نکال کر اپنی الوہیت کے اقرار اور شرک سے انکار کا عہد لیا۔" خود اسی آیت سے متضاد ہے جسے اس کے ثبوت کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ (یعنی سورۂ اعراف ۷ کی آیت ۱۷۲)

اس عقیدے کے حامل لوگوں کا دعویٰ ہے کہ تمام انسانوں کو، آدم کی پوری نسل کو ان کی پشت سے نکالا گیا جب کہ آیت کہتی ہے کہ بنی آدم کی پشتوں سے

ان کی نسلوں کو نکالا گیا۔

اس عقیدے کے خلافِ واقع ہونے کا عکاس اس آیت کا یہ دوسرا جملہ ہے کہ "یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ کہیں تم روزِ قیامت یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔" کیونکہ یہ حجت اسی وقت حجت کہلائے گی جب ہر کوئی اس سے باخبر ہو اور غفلت کا عذر نہ پیش کر سکے۔ حجت کا قاطع ہونا ضروری ہے کہ اگر کوئی فراموش بھی کردے تو یاد دلانے پر یاد آجائے۔ جب کہ اگر ہم جائزہ لیں تو کافر و منافق تو درکنار خود مومن افراد کو بھی ایسا کوئی عہد یاد نہیں۔

❁

سوال نمبر ۴۷ : قرآنِ کریم میں علمِ تاویل کے عالم کی حیثیت سے صرف خداوندِ عالم کا تعارف کرایا گیا ہے اور اس کے بعد "راسخون فی العلم" کا ذکر ہوا ہے۔ واضح کیجئے کہ۔

(الف) کیا "راسخون فی العلم" اسی طرح علمِ تاویل کے حامل ہیں جس طرح خدا اس کا عالم ہے؟

(ب) یا "راسخون فی العلم" ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو علم کی تاویل جانتے تو نہیں لیکن اس کے سامنے اپنی زبان بند رکھتے ہیں اور ساکت رہتے ہیں؟

جواب : اصل سوالات کا جواب دینے سے قبل ہم ان میں مذکور دو اصطلاحوں یعنی "تاویل" اور "راسخون فی العلم" کے لغوی اور اصطلاحی معنی کے بیان کو ضروری سمجھتے ہیں۔

تاویل

لفظ تاویل کا مصدر "اول" ہے جس کے معنی کسی کی طرف واپس ہونا یا کسی چیز کا اپنی اصل و اساس کی جانب پلٹنا اور رجوع کرنا ہے۔

یہ تو تھے تاویل کے لغوی معنی، جہاں تک تاویل کے اصطلاحی معنوں کی بات ہے تو وہ متعدد ہیں۔ مثلاً

(۱) کسی لفظ کے رائج معنی کی بجائے غیر رائج معنی مراد لینا۔

(۲) کئی ایک ممکنات میں سے کسی ایک امکان کا انتخاب کرنا۔

(۳) کسی لفظ کے ثانوی معنی کا انتخاب کرنا۔

(۴) تفسیر باطن کرنا۔

(۵) عبارت میں استعمال ہونے والے لفظ سے دستبردار ہو کر اس کے معنی کو توسیع دینا اور اس میں سے کوئی ایک معنی منتخب کرنا۔

تاویل کی مثالیں

"وان من شیعتہ لابراھیم"

"اور یقیناً نوح ہی کے پیروکاروں میں سے ابراہیم بھی تھے۔"

(سورۂ صافات ۳۷- آیت ۸۳)

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ کا شیعہ بتایا گیا ہے لیکن تاویل کرتے ہوئے انہیں حضرت علیؑ کا شیعہ کہتے ہیں۔

یا جس طرح ارشادِ الٰہی ہے۔

"فلینظر الانسان الیٰ طعامہ"

"ذرا انسان اپنے کھانے کی طرف تو نگاہ کرے۔"

(سورۂ عبس ۸۰- آیت ۲۴)

لیکن اس کی تاویل کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اپنے علم پر نگاہ کرو کہ وہ کہاں سے حاصل کیا ہے۔

اسی طرح سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے کہ۔

"الذین یؤمنون بالغیب و یقیمون الصلوٰۃ و مما رزقناھم ینفقون"

"جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ پابندی سے پورے اہتمام کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے رزق دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۳)

اس آیت کی تاویل کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ ہم نے انہیں سکھایا ہے اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

اسی طرح۔

"وفدینٰہ بذبح عظیم"

"اور ہم نے اس کا بدلہ ایک عظیم قربانی کو قرار دیا ہے"

(سورۂ صافات ۳۷- آیت ۱۰۷)

اس کی تاویل میں کہا جاتا ہے کہ اس میں ذبح عظیم سے مراد حضرت امام حسینؑ ہیں جب کہ آیت میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں۔

"راسخون فی العلم"

اب ہم "راسخون فی العلم" کے بارے میں چند معروضات پیش

کرتے ہیں۔ "راسخون فی العلم" کے بارے میں ارشادِ رب العزت ہے۔

"فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم"

"اب جن کے دلوں میں کجی ہے وہ انہی متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں تاکہ فتنہ بپا کریں اور من مانی تاویلیں کریں حالانکہ اس کی تاویل کا حق صرف خدا کو ہے اور انہیں جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں۔"

(سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۷)

"راسخون فی العلم" کی تفسیر اور اس اصطلاح کے اطلاق کے بارے میں ہمارے یہاں کافی افراط و غلو پایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ "راسخون فی العلم" کا اطلاق صرف اور صرف "ائمہ معصومینؑ" پر ہوتا ہے اور صرف انہی ذواتِ پاک کے لئے یہ اصطلاح مختص ہے۔ جب کہ یہ بات کسی لحاظ سے درست نہیں۔ نہ ہی لغت، نہ ہی "راسخون فی العلم" کی تفسیر اور نہ ہی خود روایاتِ معصومینؑ اس کی تائید کرتی ہیں۔ نیز یہ خارجی حقائق سے بھی سازگار نہیں۔ ہاں، اگر یہ کہا جائے کہ ائمہ اطہارؑ "راسخون فی العلم" کے اعلیٰ ترین مصداق ہیں اور جس قدر رسوخِ علمی انہیں حاصل ہے کوئی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تو درست ہے لیکن محض انہی کو "راسخون فی العلم" قرار دینا درست نہیں۔ ہم اس بیان کی وضاحت آئندہ سطور میں نکتہ وار کر رہے ہیں۔

○ المنجد میں ہے کہ۔

رسوخ - یعنی اپنی جگہ گڑھ جانا جیسے "رسخ الحبر فی الصحیفہ" یعنی سیاہی کتاب میں جم گئی۔ یا "رسخ العلم فی القلوب" یعنی علم دل میں رچ بس گیا۔ یا فلاں "راسخ العلم" یعنی فلاں پختہ علم والا ہے۔

مفرداتِ راغب میں ہے کہ۔

"رسوخ الشی" یعنی کسی چیز کا محکم اور اپنی جگہ بیٹھ جانا۔ "رسخ الغدیر" - یعنی جوہڑ کے پانی کا خشک ہو کر زمین میں جذب ہو جانا۔ "الراسخ فی العلم" یعنی ایسا محقق جسے کوئی شبہ پیش نہ آئے۔ گویا یہ "راسخ فی العلم" وہی لوگ ہیں جو آیت "الذین امنوا باللہ ورسولہٖ ثم لم یرتابو" "پس سچے مسلمان تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک و شبہ نہیں کیا۔ (سورۂ حجرات ۴۹۔ آیت ۱۵) میں مذکور صفت کے ساتھ متصف کئے گئے ہیں۔ اسی طرح سورۂ نساء میں فرمایا ہے "لٰکن الراسخون فی العلم منھم" (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۶۲) لیکن (اے پیغمبرؐ) ان میں سے جو علم میں بڑی پائے گاہ رکھتے ہیں۔"

○ ایک آیتِ قرآن علمائے یہود کو "راسخون فی العلم" بتاتے ہوئے کہتی ہے۔

"لٰکن الراسخون فی العلم منھم والمؤمنون یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک"

"لیکن ان میں سے جو لوگ علم میں رسوخ رکھنے والے اور ایمان لانے

والے ہیں وہ اس سب پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل ہوا ہے یا تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے۔" (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۶۲)

○ ابنِ عباس جو غیر معصوم ہیں وہ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم "راسخون فی العلم" ہیں۔

○ امیرالمومنین حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں ایک مقام پر ایسے انسان کو "راسخون فی العلم" کہتے ہیں جو بغیر کسی دلیل کے اور بے جا اپنی علمی حدود سے تجاوز نہیں کرتا اور جہاں اس کی فہم و فراست ختم ہو جاتی ہے وہاں بلا ہچکچاہٹ خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔

"راسخین فی العلم" وہی لوگ ہیں جو غیب کے پردوں میں چھپی ہوئی ساری چیزوں کا اجمالی طور پر اقرار کرتے (اور ان پر اعتقاد رکھتے) ہیں۔ اگرچہ ان کی تفسیر و تفصیل نہیں جانتے۔ اور یہی اقرار انہیں غیب کے پردوں میں در آنہ گھسنے سے بے نیاز بنائے ہوئے ہے اور اللہ نے اس بات پر ان کی مدح کی ہے کہ جو چیز ان کے احاطۂ علم سے باہر ہوتی ہے اس کی رسائی سے اپنے عجز کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اور اللہ نے جس چیز کی حقیقت سے بحث کرنے کی تکلیف نہیں دی اس میں جستجو و کاوش کے ترک ہی کا نام رسوخ رکھا ہے۔" (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۸۹ از ترجمہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ نمبر ۹۰ از ترجمہ مولانا مرتضیٰ حسین صدر الافاضل)

○ آیت میں "والراسخون فی العلم" کی "و" کے بارے میں مفسرینِ قرآن دو آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک رائے یہ کہ ممکن ہے یہ "و" عاطفہ ہو۔

اس صورت میں کہا جائے گا کہ تاویل کا علم یا خدا جانتا ہے یا "راسخون فی العلم" یعنی ائمۂ اطہارؑ۔ دوسری رائے یہ ہے کہ "و" کو ابتدائیہ قرار دیا جائے۔ اس صورت میں "راسخون فی العلم" وہ لوگ قرار پاتے ہیں جو ان باتوں کے بارے میں توقف کرتے ہیں جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہیں اور اپنی عاجزی کی بنا پر ان سے ناسمجھی کا اظہار کرتے ہیں اور یوں اس صورت میں "رسوخ فی العلم" ائمۂ معصومینؑ تک ہی محدود نہیں رہتا جس کی تائید اس سے قبل نکتے میں ذکر کئے گئے جناب امیرؑ کے خطبے اور دوسرے شواہد سے بھی ہوتی ہے۔

○ "راسخون فی العلم" کی صفت صرف ائمہ سے مختص نہ ہونے کی ایک دلیل، مذکورہ بالا آیت (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۷) کے بعد والی آیت ہے جس میں "راسخون فی العلم" کی زبانی کہلوایا گیا ہے کہ "پروردگار جب تو نے ہمیں ہدایت دے دی ہے تو اب ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا ہونے پائے۔" (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۸) اس آیت سے ظاہر ہے کہ "راسخون فی العلم" کو منافقین کے مقابل پیش کیا گیا ہے۔ منافقین سے ان کا موازنہ کیا گیا ہے اور مزاجِ قرآن یہ ہے کہ وہ معصومینؑ سے منافقین کا موازنہ نہیں کرتا بلکہ مومنین سے منافقین کا موازنہ کرتا ہے۔

○ بہت سے اصحابِ اہلِ بیتؑ کے بارے میں خود ائمۂ معصومینؑ نے گواہی دی ہے کہ وہ لامحدود علم کے مالک ہیں۔ جیسے فرمان ہے کہ "سلمان کا علم لامحدود ہے۔" میثمِ تمار، رشیدِ ہجری، ہشام بن حکم، مومنِ طاق وغیرہ علمِ غیب کے حامل ہیں۔ یعنی جانتے ہیں کہ کون کب وفات پائے گا، کس کے ہاتھوں مارا جائے گا،

کب بیمار ہوگا، کب آفت میں مبتلا ہوگا۔

ان بیانات کی روشنی میں واضح ہے کہ "راسخون فی العلم" محض ائمہ معصومینؑ نہیں بلکہ آپ حضرات علیہم السلام اس کا مفہومِ جلی اور تمام دوسرے "راسخون فی العلم" کا مصدر و مرکز ہیں۔

ہاں ! ایک بات جو کھٹکتی ہے وہ ائمہؑ کا بارہا یہ فرمانا ہے کہ صرف ہم "راسخون فی العلم" ہیں اور اس کا دعویٰ کرنے والے دوسرے تمام لوگ جھوٹے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ائمہؑ کا یہ قول ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ان کے مقابل آکھڑے ہوتے ہیں، ان کی ضد میں فتویٰ سازی کرتے ہیں، ان سے بے نیاز ہو کر دینی مسائل میں اظہارِ رائے کرتے ہیں۔

❁

سوال نمبر ۴۸ : قرآنِ کریم کی سورہ آلِ عمران آیت نمبر ۱۵۹ میں خداوندِ عالم نے پیغمبرِ اسلامؐ کو امت سے متعلق امور میں لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیا امت سے مشورہ لینا۔

(الف) امت کی حوصلہ افزائی کی نیت سے ہے؟

(ب) پیغمبرؐ مشورے کے ذریعے امت سے مدد لینا چاہتے ہیں؟

(ج) پیغمبرؐ امت کو اپنے کاموں میں شریک کرنا چاہتے ہیں؟

(د) یا امت پر اس سنت کو قائم کرنے کی غرض سے مشورہ کرتے ہیں؟

جواب : ارشادِ رب العزت ہے۔

"وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ"

"اور معاملات میں ان کو بھی شریکِ مشورہ کرو، پھر جب تمہارا عزم کسی

رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔"

(سورہ آلِ عمران ۳- آیت ۱۵۹)

اگر آیت پر غور و تامل کیا جائے تو مذکورہ بالا چاروں صورتوں کے مقصود ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ پیغمبرِ اسلامؐ دو حیثیتوں کے مالک ہیں۔

(۱) نبی و رسول کی حیثیت : یعنی پیغمبر پر فرامینِ الٰہی وحی کی صورت میں نازل ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں پیغمبرؐ نہ کسی کے محتاج ہیں اور نہ اس میں ان کا کوئی شریک ہے۔

(۲) قائد و رہبر کی حیثیت : شریعت کے نفاذ و اجراء کے لئے ہر پیغمبرؑ اور امامؑ امت کی مدد و تعاون کا محتاج ہے۔ چنانچہ خداوندِ عالم نے انبیاء اور ہادیانِ برحق کی پیروی کی تاکید کی ہے اور مفسرین ان آیات کی تفسیر میں جن میں خدا کے دین کی نصرت کی تاکید کی گئی ہے کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہادیانِ دین کی نصرت و اعانت ہے۔

مذکورہ آیت میں پیغمبرؐ کو مشورہ لینے کی جو تاکید کی گئی ہے اس کا مقصد جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا وہ چاروں مقاصد ہیں جن کا ذکر ہم نے سوال میں کیا ہے۔

چنانچہ ہم سیرت و حیاتِ رسولؐ میں متعدد مقامات پر اس قسم کی مشورت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مثلاً

○ جنگِ خندق کے موقع پر حضرت سلمانِ فارسیؓ کے مشورے سے خندق کھدوائی۔

○ صلح حدیبیہ کے موقع پر اصحاب کے مشورے سے ان سے بیعت کی تجدید

کی۔

یہ عمل پیغمبرؑ کے نقص کی علامت نہیں اور نہ ہی دوسروں کے مشورے کو مسلط کرنے کی علامت ہے۔ کیونکہ پیغمبرؑ اگر دوسروں کے مشورے پر عمل کرتے بھی ہیں تو بہرحال آخری فیصلہ انہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

یہ کہنا بھی درست ہے کہ یہ سنت امت میں جاری کرنے کے لئے پیغمبرؑ نے از خود مشورہ طلب کرنے کا سلسلہ جاری رکھا کیونکہ ایک آیت میں بھی خداوندِ عالم امت کو باہمی مشورے کی تاکید کرتا ہے۔

❁

سوال نمبر۴۹ : انسان کیونکہ علمِ کل کا مالک نہیں اس لئے اکثر مواقع پر شک و شبہ اور تردد کا شکار رہتا ہے۔ مگر ذاتِ خدا کیونکہ علمِ کل کی مالک ہے اس لئے اس سے تردد کے اظہار کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں چند مقامات پر خدا کی طرف سے تردد کا اظہار محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً

حضرت یونسؑ کے بارے میں فرمایا کہ انہیں ایک ہزار یا اس سے زائد افراد کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا۔

یا پھر کچھ لوگوں کے قلوب کے بارے میں کہا گیا کہ ان کی شقاوت پتھر جیسی یا اس سے بھی سخت ہے۔

وضاحت کیجئے کہ ایسا کیوں ہے؟

جواب : حضرت یونسؑ کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے کہ۔

"وارسلنٰہ الیٰ مائۃ الف او یزیدون"

"اور انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ کی قوم کی طرف نمائندہ بنا کر

بھیجا۔" (سورۂ صافات ۳۷۔ آیت ۱۴۷)

بعض لوگوں کے خیال کے مطابق اس آیۂ کریمہ سے خدا کا تردد جھلکتا ہے، یعنی اسے اس بات میں شک تھا کہ حضرت یونسؑ جن لوگوں کو اپنی دعوت پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں ان کی تعداد یا تو ایک لاکھ ہے یا اس سے زائد، اس بارے میں (نعوذ باللہ) قطعی علم اللہ کے پاس نہ تھا۔

نہیں، ان لوگوں کا یہ خیال درست نہیں۔ دراصل حضرت یونسؑ دو مرتبہ اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ پہلی مرتبہ جب آپؑ بھیجے گئے تو آپؑ نے جس قوم کو دعوت دی اس کی تعداد ایک لاکھ تھی، لیکن جب آپؑ فرار ہو کر شکمِ ماہی میں مقید ہوئے اور استغفار کے بعد وہاں سے آزاد ہو کر دوبارہ قوم کی طرف بھیجے گئے تو اس وقت ان کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہو چکی تھی۔

یہ آیت دراصل ان کی نبوت کے دونوں ادوار کو شامل کر کے تعداد کا ذکر کرتی ہے۔ ہاں اگر کسی ایک دور کی جانب واضح اشارہ کر کے یہ کہتی تو اعتراض کیا جا سکتا تھا۔

دوسری آیت جس سے (نعوذ باللہ) خدا کا شک میں مبتلا ہونا جھلکتا ہے وہ یہ ہے۔

"ثم قست قلوبکم من بعد ذالک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ وان من الحجارۃ"

"پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی کچھ زیادہ سخت۔" (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۷۴)

یہاں بھی اس خیال کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ یہ آیت تمام انسانوں کے

قلوب کو شامل کئے ہوئے ہے اور کیونکہ لوگوں کے قلوب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں' ایک جیسے نہیں ہوتے' بعض پتھر کی طرح سخت ہوتے ہیں اور بعض اس سے بھی زیادہ اس لئے یہ بات کہنا شک کی دلیل نہیں۔

❁

سوال نمبر۵۰ : اہلِ تشیع اور اہلِ سنت دونوں فرقے ایک دوسرے پر قرآن کی تحریف کا الزام لگاتے ہیں۔ دونوں ہی فرقوں کی کتب میں تحریفِ قرآن ظاہر کرنے والی احادیث اور علماء کے اقوال ملتے ہیں۔ لیکن دونوں فرقوں کے محقق علما آیاتِ قرآنی کی رو سے قرآن کی تحریف کی مخالفت کرتے ہیں۔

ان آیات کا حوالہ دیجئے جو یہ علماء قرآنِ کریم کے عدم تحریف کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں؟

جواب : علمائے اسلام قرآن کے تحریف سے مبرّہ اور پاک ہونے کے ثبوت کے طور پر درجِ ذیل آیاتِ قرآنی پیش کرتے ہیں۔

"اور تم لوگ کس طرح کافر ہو جاؤ گے جب کہ تمہارے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت ہو رہی ہے اور تمہارے درمیان رسول موجود ہے۔" (سورۂ آلِ عمران ۳- آیت ۱۰۱)

"ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔" (سورۂ حجر ۱۵- آیت ۹)

"بے شک جن لوگوں نے قرآن کے آنے کے بعد اس کا انکار کر دیا ان کا انجام بُرا ہے اور یہ ایک عالی مرتبہ کتاب ہے جس کے قریب سامنے یا پیچھے کسی طرف سے باطل آ بھی نہیں سکتا کہ یہ خدائے حکیم و حمید کی

نازل کی ہوئی کتاب ہے۔" (سورۂ فصلت ۴۱- آیت ۴۱-۴۲)

❁

سوال نمبر۵۱ : انبیاءؑ اپنے دعویٰ نبوت کے لئے معجزے سے استدلال کرتے تھے' اسی بناء پر خدا نے ہر نبی کو اس کے زمانے کے حسبِ حال معجزے سے نوازا اور انبیاءؑ نے لوگوں کے اعتراض پر معجزے کے ذریعے اپنی حقانیت کا ثبوت دیا۔ لیکن قرآنِ کریم میں ملتا ہے کہ لوگوں نے پیغمبرِ اسلامؐ سے بعض معجزے طلب کئے مگر خدا نے ان معجزوں کو ظاہر کرنے سے انکار کر دیا۔ بتایئے وہ معجزے کیا تھے جو طلب کئے گئے اور ان کو ظاہر نہ کرنے کے کیا اسباب تھے؟

جواب : سورۂ بنی اسرائیل کی آیات میں ان معجزات کا ذکر ہے جن کا مطالبہ اس زمانے کے لوگوں نے آنحضورؐ سے کیا اور خدا نے جن کے اظہار سے انکار کیا۔ آیات پیشِ خدمت ہیں۔

"اور ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لئے زمین سے چشمہ نہ جاری کر دو۔ یا تمہارے پاس کھجور اور انگور کے باغ ہوں جن کے درمیان تم نہریں جاری کر دو۔ یا ہمارے اوپر اپنے خیال کے مطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دو۔ یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دو۔ یا تمہارے پاس سونے کا کوئی مکان ہو۔ یا تم آسمان کی بلندی پر چڑھ جاؤ اور اس بلندی پر بھی ہم ایمان نہ لائیں گے جب تک کوئی ایسی کتاب نازل نہ کر دو جسے ہم پڑھ لیں۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷- آیات ۹۰ تا ۹۳)

ان معجزات کو ظاہر نہ کرنے کے اسباب درجِ ذیل ہیں۔

(۱) ان میں سے بعض معجزات کا ظہور محالِ عقلی ہے۔ مثلاً خدا اور فرشتوں کا نظارہ کرانا۔ اگر خدا جسم و جسمانیت میں ظاہر ہو تو وہ خدا نہیں، اسی طرح اگر فرشتے انسان کی صورت میں نمودار ہوتے تو کفار کہتے کہ یہ تو انسان ہی ہیں۔

(۲) چشمہ جاری ہونا یا باغات تیار ہونا نبوت پر دلیل نہیں، کیونکہ ہر کوئی یہ باغات تیار کر سکتا ہے۔

(۳) اگر آسمان ان پر گرا دیا جاتا تو ان کا قصہ ہی پاک ہو جاتا پھر معجزہ کس کام آتا۔

(۴) اگر آسمان سے کوئی تحریر لانے کا مطالبہ پورا کر دیا جاتا تو بھی اس کے ماننے کی کیا ضمانت تھی، وہ اسے بھی جھٹلا دیتے۔

بہرحال ان مطالبات کی نہ معقولیت کی وجہ سے خدا نے ان کے اظہار کا انکار کیا۔

*

سوال نمبر۵۲ : قرآنِ کریم میں ہے کہ آدم کو خلق کرنے سے قبل خدا نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں آدم کو خلق کرنے والا ہوں، اس کی تخلیق کے بعد تم اسے سجدہ کرنا۔ جب کہ یہی قرآن خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنے سے منع کرتا ہے۔ واضح کیجئے کیا۔

(الف) جس سجدے کی دعوت دی گئی وہ شکر کا سجدہ تھا؟

(ب) آدم کو قبلہ بنا کر خود خدا کو سجدہ کرنا مطلوب تھا؟

(ج) خود حضرت آدم کے سامنے خضوع و تسلیم کا حکم تھا؟

جواب : جی ہاں ! آیاتِ قرآن صرف خدا کو لائقِ سجدہ قرار دیتی ہیں، جیسے۔

"واسجدوا للہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون"

"بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اگر واقعاً اس کی عبادت کرنے والے ہو۔" (سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۳۷)

"وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا"

"اور مساجد سب اللہ کے لئے ہیں لہٰذا اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا۔" (سورۂ جن ۷۲۔ آیت ۱۸)

چنانچہ آدمؑ کو سجدہ کرنے کے حوالے سے سوال میں مذکور کون سا مفروضہ درست ہے اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

(الف) آدم کو قبلہ بنا کر خود خدا کو سجدہ کرنا مطلوب تھا؟

یہ مفروضہ اس لئے درست نہیں کہ خدا جس سجدے کا فرشتوں سے تقاضا کرتا ہے وہ فرشتوں کی جانب سے آدم کی تعظیم و احترام اور ان کی طرف سے آدم کی فضیلت کے اعتراف کے طور پر ہے اور حضرت آدمؑ کو قبلہ بنا کر خود خدا کو سجدہ کرنے میں حضرت آدمؑ کی کوئی فضیلت نہیں، اس سے فرشتوں پر آدمؑ کی برتری ثابت نہیں ہوتی۔

اس بات کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ کے کعبہ یا بیت المقدس کی سمت رخ کر کے نماز پڑھنے سے ان مقامات کو آنجناب پر فضیلت حاصل نہیں ہوتی بلکہ آنحضرتؐ کو بہرحال ان پر فضیلت حاصل ہے جس کا اعلان خداوندِ عالم سورۂ بلد میں ان الفاظ میں کرتا ہے کہ۔

"لا اقسم بھذا البلد وانت حل بھذا البلد"

"میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔" (سورہ

بلد ۹۰- آیت ۱- ۲)

(ب) خود حضرت آدم کے سامنے خضوع و تسلیم کا حکم ہے؟

بعض اس مفروضے کی تائید کرتے ہیں اور بعض نے ان الفاظ میں اس پر اعتراض کیا ہے کہ سجدہ خضوع و تسلیم کا اعلیٰ ترین مظہر ہے اس لئے یہ غیرِ خدا کے لئے جائز نہیں۔ قرآنِ کریم میں جہاں بھی سجدے کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں خدا ہی کو سجدہ کرنا مطلوب ہے اور سجدے کو صرف خدا کے لئے مخصوص قرار دیا گیا ہے اور کیونکہ اس مسئلہ میں بھی خدا نے فرشتوں کو آدم کو سجدہ کرنے کا فرمان دیا ہے اس لئے یہ سجدہ آدم کے لئے نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ جو اس مفروضے کو تسلیم کرتے ہیں ان کا یہ کہنا کہ یہاں سجدے کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس سے مراد سجدے سے کم درجے کے خضوع و تسلیم کا اظہار ہے، درست نہیں اور سجدے کے لغوی معنی میں بے جا تصرف ہے۔

(ج) جس سجدے کی دعوت دی گئی وہ شکر کا سجدہ تھا؟

اس مفروضے پر اعتراض کی گنجائش نہیں اور یہ دراصل آدمؑ کے وجود میں آنے پر شکر کا سجدہ ہی تھا۔ کیونکہ آدم کی تخلیق اہلِ کائنات پر خدا کی ایک عظیم نعمت و موہبت ہے۔

❁

سوال نمبر ۵۳ : قرآنِ کریم میں انسانی اعمال کے محو ہو جانے کی دو مثالیں دی گئی ہیں۔

(الف) بُرے اعمال : انسان کے اعمالِ بد محو ہو جاتے ہیں جنہیں مغفرت (غفران) کہا گیا ہے۔ بتایئے کونسی چیزیں اعمالِ بد کی مغفرت کا سبب بنتی ہیں؟

(ب) نیک اعمال : انسان کے نیک اعمال محو ہو جاتے ہیں جنہیں حبطِ اعمال کہا جاتا ہے۔ بتایئے وہ کون سی چیزیں ہیں جن کے ذریعے انسانوں کے نیک اعمال حبط (ضائع) ہو جاتے ہیں؟

جواب : نکتہ وار جواب حاضر ہے۔

(الف) اعمالِ بد کے محو ہو جانے کا سبب بننے والی چیزیں قرآنِ کریم اور روایاتِ معصومینؑ کی روشنی میں درجِ ذیل ہیں۔

(۱) توبہ : ارشادِ الٰہی ہے :

"پھر ظلم کے بعد جو شخص توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرے تو خدا اس کی توبہ قبول کرلے گا کہ اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

(سورۂ مائدہ ۵- آیت ۳۹)

(۲) گناہانِ کبیرہ سے اجتناب : ارشادِ الٰہی ہے :

"اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمہیں روکا گیا ہے پرہیز کرلوگے تو ہم دوسرے گناہوں کی پردہ پوشی کردیں گے اور تمہیں باعزت منزل تک پہنچادیں گے۔" (سورۂ نساء ۴- آیت ۳۱)

"جو لوگ گناہانِ کبیرہ اور فحش باتوں سے پرہیز کرتے ہیں بے شک آپ کا پروردگار ان کے لئے بہت وسیع مغفرت والا ہے۔"

(سورۂ نجم ۵۳- آیت ۳۲)

(۳) شفاعت

(۴) نیک اعمال

(ب) انسان کے نیک اعمال مندرجہ ذیل باتوں سے حبط (ضائع و برباد)

ہو جاتے ہیں۔

(۱) کفر : ارشادِ الٰہی ہے :

"اور جو بھی ایمان سے انکار کرے گا اس کے اعمال یقیناً برباد ہو جائیں گے اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہو گا۔"

(سورۂ مائدہ ۵- آیت ۶)

(۲) شرک : ارشادِ الٰہی ہے :

"اگر یہ لوگ شرک اختیار کر لیتے تو ان کے سارے اعمال برباد ہو جاتے۔" (سورۂ انعام ۶- آیت ۸۸)

(۳) اپنی آواز کو پیغمبرؐ کی آواز سے بلند کرنا : ارشادِ الٰہی ہے :

"ایمان والو خبردار اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرنا اور ان سے اس طرح بلند آواز میں بات بھی نہ کرنا جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور بھی نہ ہو۔" (سورۂ حجرات ۴۹- آیت ۲)

(۴) عدم ایمان : ارشادِ الٰہی ہے :

"یہ لوگ شروع ہی سے ایمان نہیں لائے ہیں لہٰذا خدا نے ان کے اعمال کو برباد کر دیا ہے اور خدا کے لئے یہ کام بڑا آسان ہے۔"

(سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۱۹)

(۵) خدا اور رسولؐ کو جھٹلانا : ارشادِ الٰہی ہے :

"اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ہے ان کے اعمال برباد ہیں اور ظاہر ہے کہ انہیں ویسا ہی بدلہ تو دیا جائے گا

جیسے اعمال کر رہے ہیں۔" (سورۂ اعراف ۷- آیت ۱۴۷)

(۶) مرتد ہو جانا : ارشادِ الٰہی ہے :

"اور جو بھی اپنے دین سے مرتد ہو جائے گا اور کفر کی حالت میں مر جائے گا اس کے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور وہ جہنمی ہو گا اور وہیں ہمیشہ رہے گا۔"

❁

سوال نمبر ۵۴ : آسمانی کتب کی صورت میں بشریت کے لئے پیغامِ الٰہی لانے والی ہستیوں کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم ان انبیاء و رسل کی کیا ذمہ داریاں اور فرائض بیان کرتا ہے؟ آیات کے حوالے سے جواب دیجئے۔

جواب : قرآنِ کریم انبیاءؑ و رسل کی درجِ ذیل ذمہ داریوں اور فرائض کا تذکرہ کرتا ہے۔

(۱) لوگوں کی تعلیم اور تزکیۂ نفس۔

"جس طرح ہم نے تمہارے درمیان تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر ہماری آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ تمہیں پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ سب کچھ بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۱۵۱)

(۲) تبشیر و انذار۔

"اے پیغمبر ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۱۱۹)

(۳) طاغوت کا انکار اور لوگوں کو خدا کی بندگی کی دعوت۔

"اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔" (سورۂ نحل ۱۶- آیت ۳۶)

(۴) لوگوں کی گردنوں سے طوق اور زنجیریں اتارتا ہے۔

"اور (رسول) ان پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اٹھا دیتا ہے۔" (سورۂ اعراف ۷- آیت ۱۵۷)

(۵) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

"وہ (رسول) نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔"

(سورۂ اعراف ۷- آیت ۱۵۷)

(۶) عدل و قسط کا قیام۔

"بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔" (سورۂ حدید ۵۷- آیت ۲۵)

❁

سوال نمبر ۵۵ : قرآنِ کریم بعض جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو درجِ ذیل تین سزاؤں میں سے کوئی ایک سزا دینے کی ہدایت کرتا ہے۔

(الف) یا تو انہیں قتل کر دیا جائے۔

(ب) یا ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے جائیں۔

(ج) یا انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔

بتایئے کن جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کی یہ سزائیں ہیں؟ آیت کا حوالہ بھی دیجئے۔

جواب : قرآنِ کریم خدا اور رسولؐ سے جنگ کرنے والوں، یعنی حکمِ شریعت کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالنے والوں اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کے لئے یہ سزائیں تجویز کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"پس خدا اور رسول سے جنگ کرنے والے اور زمین میں فساد کرنے والوں کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے، یا سولی پر چڑھا دیا جائے، یا ان کے ہاتھ اور پیر مختلف سمتوں سے قطع کر دیئے جائیں، یا انہیں ارضِ وطن سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔"

(سورۂ مائدہ ۵- آیت ۳۳)

❁

سوال نمبر ۵۶ : قرآنِ کریم کی بعض آیات پیغمبرِ اسلامؐ کو کفار سے جنگ پر ابھارتی ہیں۔ نیز کہتی ہیں کہ فتنے کے خاتمے تک جنگ کرو۔ پیغمبرِ اسلامؐ اپنے دورِ حیات میں دس سال کفار سے مشغولِ جنگ رہے۔ اسی طرح ایک آیت میں فرمانِ الٰہی ہے کہ "یاایھاالنبی جاھدالکفار والمنافقین" "اے رسول! کفار و منافقین کے خلاف جہاد کرو۔" (سورۂ توبہ ۹- آیت ۷۳) بتایئے پیغمبرؐ نے منافقین کے خلاف کونسی جنگ لڑی؟

جواب : جس طرح پیغمبرِ اسلامؐ نے دس سال کفار سے جنگ کی اسی طرح دس سال منافقین سے بھی برسرِ پیکار رہے۔ البتہ کفار اور منافقین سے مقابلے کی صورت میں فرق ہے۔ جیسا کہ آیت میں بھی ہے کہ کفار کے خلاف جنگ کے

لئے "قاتلو" کا لفظ آیا ہے، جو صرف اسلحہ ہی سے ممکن ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ نے ان کے خلاف تلوار سے جہاد کیا۔ لیکن منافقین کے خلاف مقابلے کے بارے میں آیت "جہاد" کا لفظ استعمال کرتی ہے، جس کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے رازوں کو افشا کرنا، ان کا بائیکاٹ کرنا، ان کی مسجد کو ڈھا دینا۔ الغرض انہیں کمزور کرنے اور ناکامیاب بنانے کے لئے جدوجہد جہاد سے عبارت ہے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبرؐ نے کفار کے خلاف تو گرم جنگ لڑی لیکن منافقین کے خلاف سرد جنگ میں مشغول رہے۔

❁

سوال نمبر ۵۷ : قرآنِ کریم میں ارشادِ خداوندی ہے "اے پیغمبر ہم نے آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" وضاحت کیجئے کہ کیا پیغمبرِ اسلامؐ کا صرف جسمانی وجود رحمت تھا، یا پیغمبرؐ کی شریعت و تعلیمات عالمین کے لئے رحمت ہیں؟

اگر پیغمبرِ اسلامؐ کی شریعت عالمین کے لئے رحمت ہے تو کیا یہ رحمت پورے عالم میں پہنچ چکی ہے، یا آئندہ کبھی پہنچے گی؟ آیت سے استدلال کیجئے۔

جواب : پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وجودِ مقدس کے رحمتِ خدا ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ لیکن آیتِ قرآن میں "رحمت اللعالمین" سے مراد آنحضرتؐ کی شریعت اور آپؐ کی تعلیمات ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو کسی صورت بے جا نہ ہوگا کہ اب تک بھی عالمین اس رحمت سے مکمل طور پر فیضیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ آئندہ اس رحمت سے پورے عالم کے فیضیاب ہونے کی بشارت درجِ ذیل آیاتِ قرآنی سے مترشح ہے۔

"اللہ نے تم میں سے صاحبانِ ایمان و عملِ صالح سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں روئے زمین میں اس طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا ہے اور ان کے لئے اس دین کو غالب بنائے گا جسے ان کے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اور ان کے خوف کو امن میں تبدیل کردے گا۔" (سورۂ نور ۲۴- آیت ۵۵)

"اور ہم نے ذکر کے بعد زبور میں بھی لکھ دیا ہے کہ ہماری زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہی ہوں گے۔" (سورۂ انبیاء ۲۱- آیت ۱۰۵)

"اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کو زمین میں کمزور بنا دیا گیا ہے ان پر احسان کریں اور انہیں لوگوں کا پیشوا بنائیں اور زمین کا وارث قرار دیں۔" (سورۂ قصص ۲۸- آیت ۵)

"وہی وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام ادیانِ عالم پر غالب بنائے اور گواہی کے لئے صرف خدا ہی کافی ہے۔" (سورۂ فتح ۴۸- آیت ۲۸)

"وہی خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب بنائے چاہے یہ بات مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔" (سورۂ صف ۶۱- آیت ۹)

❁

سوال نمبر ۵۸ : خداوندِ عالم نے حضرت مریم کو عالمین کی خواتین میں سے منتخب کیا ہے۔

(الف) کیا وہ اپنے دور کی خواتین میں سے منتخب ہیں، یا ہر دور حتیٰ دورِ حاضر کی

خواتین میں سے بھی؟

(ب) اگر تمام ادوار اور زمان کی عورتوں میں سے منتخب و ممتاز ہیں تو کیا ہر جہت سے یا کسی ایک خاص جہت سے؟

جواب : آیتِ قرآن ہے۔

"واذ قالت الملائکة یا مریم ان اللہ اصطفاک وطھرک واصطفاک علیٰ نساء العالمین"

"اور اس وقت کو یاد کرو جب فرشتوں نے مریم کو آواز دی کہ خدا نے تمہیں چن لیا ہے اور پاکیزہ بنادیا ہے اور عالمین کی عورتوں میں منتخب قرار دے دیا ہے۔" (سورۂ آلِ عمران ۳- آیت ۴۲)

مذکورہ آیتِ کریمہ کی روشنی میں حضرت مریم کو عالمین کی عورتوں میں سے منتخب خاتون قرار دیا جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مریم کو صرف اپنے دور کی خواتین میں سے منتخب کیا گیا ہے تو یہ آیت کے برخلاف ہے۔ کیونکہ آیت میں لفظ "العالمین" استعمال ہوا ہے جو جمع ہے۔ علاوہ ازایں یہ کہ آیت میں صرف لفظ "عالمین" ہی نہیں بلکہ "العالمین" ہے یعنی حضرت مریم کو رہتی دنیا تک تمام جہانوں کی عورتوں میں سے منتخب کیا ہے۔ جب کہ وہ دور جس میں حضرت مریم نے زندگی بسر کی وہ محدود ہے جو عالمین نہیں کہلا سکتا۔

اگر یہ تصور کیا جائے کہ حضرت مریمؑ کو تمام جہات سے رہتی دنیا تک تمام عالمین کی عورتوں میں سے منتخب کیا گیا ہے تو یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ مسلّمہ طور پر دخترِ رسول حضرت فاطمۃ الزہراؑ تمام عالمین کی عورتوں پر افضل ہیں جس کا

ثبوت آیۂ تطہیر اور احادیثِ رسولؐ ہیں اور آپؑ سوائے درجۂ نبوت کے تمام درجات میں پیغمبرِ اسلامؐ کی ہم پلہ ہیں۔

لہٰذا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ حضرت مریمؑ کو کسی خاص صفت، خاص جہت میں عالمین کی عورتوں میں سے منتخب کیا گیا ہے اور وہ صفت ان سے بغیر شوہر کے بچے کی ولادت ہے۔

❁

سوال نمبر۵۹ : متعدد آیات میں خداوندِ عالم اپنے انبیاءؑ سے فرماتا ہے کہ "آپ اپنی امتوں سے کہہ دیجئے کہ ہم رسالت و پیغامِ الٰہی کے (ابلاغ کے) معاوضہ کے طور پر کسی اجر کے خواہاں نہیں، ہمیں خدا اجر دے گا۔" دوسری طرف پیغمبرِ اسلامؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپؐ اجرِ رسالت کے طور پر مودتِ ذوی القربیٰ طلب فرمائیں۔ (سورۂ شوریٰ ۴۱- آیت ۲۳) آیت کے حوالے سے واضح کیجئے کہ۔

(الف) کیا یہ مودت خود پیغمبرؐ کے فائدے میں ہے؟

(ب) یا یہ مودت رکھنا امت کے مفاد میں ہے؟

(ج) یا امت کی مودت سے رسولؐ کے "ذوی القربیٰ" کو فائدہ پہنچے گا؟

جواب : قرآنِ کریم میں اجرِ رسالت کے طور پر رسولؐ نے اپنے اقربا سے محبت کا جو مطالبہ کیا ہے وہ دراصل پیغمبرؐ کی رسالت کا معاوضہ نہیں۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ اس سے پیغمبرؐ کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ یہ سنت و سیرتِ انبیاءؑ کے بھی خلاف ہے۔ دراصل جس اجر کا پیغمبرِ اسلامؐ مطالبہ کر رہے ہیں وہ خود امت ہی کے مفاد میں ہے۔ جیسا کہ آیت ہے۔

"کہہ دیجئے کہ میں جو اجر مانگ رہا ہوں وہ بھی تمہارے ہی لئے ہے' میرا حقیقی اجر تو پروردگار کے ذمہ ہے اور وہ ہر شے کا گواہ ہے۔"

(سورۂ سبا ۳۴- آیت ۴۶)

پیغمبرؐ کی طلب کردہ اجرت کی نوعیت کے بارے میں قرآنِ کریم کا فرمان ہے۔

"میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے پروردگار کا راستہ اختیار کرلے۔" (سورۂ فرقان ۲۵- آیت ۵۷)

سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۲۳ میں پیغمبرؐ نے دیگر انبیاء کے برخلاف اقرباء سے محبت کے عنوان سے جو اجرت طلب کی ہے' اس اجرت طلب کرنے پر اعتراض اس صورت میں درست ہوتا جب اس میں مذکور استثنیٰ' استثنیٰ متصل ہوتا جس کے تحت اس کا فائدہ پیغمبرؐ کو جاتا۔ جب کہ علماء تفسیر اور عربی لغت کے ماہرین اس استثنیٰ کو استثنیٰ منفصل کہتے ہیں۔

❁

سوال نمبر ۶۰ : قرآنِ کریم میں حضرت محمدؐ کی شناخت کے لئے علمِ کتاب کا حامل ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے (سورۂ رعد ۱۳- آیت ۴۳)۔ وضاحت کیجئے کہ :

(الف) کتاب سے مراد صرف قرآنِ کریم ہے یا تمام کتبِ آسمانی؟

(ب) اس سے مراد پوری کتاب کا علم ہے یا اس کی بعض باتوں کا؟

جواب : سوال کا پہلا جزیہ ہے کہ کتاب سے مراد قرآنِ کریم ہے یا تمام آسمانی کتب۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ قرآنِ مجید میں چار کتب کا ذکر ہوا ہے۔ جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

(۱) - کتاب یعنی تورات' انجیل' زبور وغیرہ : ارشادِ الٰہی ہے۔

"اور یہ کافر کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں ہیں تو کہہ دیجئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان رسالت کی گواہی کے لئے خدا کافی ہے اور وہ شخص کافی ہے جس کے پاس پورا علمِ کتاب ہے۔" (سورۂ رعد ۱۳- آیت ۴۳)

اس آیت میں کتاب سے مراد آسمانی کتب ہیں جو قرآنِ کریم سے پہلے نازل ہوئیں اور جن کا علم اہلِ کتاب کے علماء کے پاس تھا اور وہ کتابیں تورات' انجیل اور زبور وغیرہ تھیں۔

(۲) - کتاب یعنی قرآنِ کریم : اس کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے۔

"اگر تمہیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کا جیسا ایک سورہ ہی لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جتنے تمہارے مددگار ہیں سب کو بلالو اگر تم اپنے دعوے اور خیال میں سچے ہو۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۳)

(۳) - کتاب یعنی کُل کائنات : ارشادِ قدرت ہے۔

"اور ایک شخص نے جس کے پاس کتاب کا ایک حصہ علم تھا اس نے کہا میں اتنی جلدی لے آؤں گا کہ آپ کی پلک بھی نہ جھپکنے پائے گی----" (سورۂ نمل ۲۷- آیت ۴۰)

اس آیت میں جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے وہ حضرت سلیمانؑ کا وزیرِ اعظم آصف برخیا ہے' جسے کائنات پر تصرف حاصل تھا۔

(۴) - قرآن میں کتاب کے عنوان سے کتابِ اعمال کا بھی تذکرہ ہوا ہے : ارشاد ہے۔

"اور ہم نے ہر انسان کے نامۂ اعمال کو اس کی گردن میں آویزاں کردیا ہے اور روزِ قیامت اسے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پیش کردیں گے۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷- آیت ۱۳)

لیکن پیغمبر کی شناخت کے لئے جس کتاب کے علم کا ذکر آیا ہے وہ تورات، زبور اور انجیل بھی ہیں اور قرآنِ کریم بھی۔ بہت سی آیاتِ قرآنی اہلِ کتاب کے سامنے پیغمبرِ اسلامؐ کی صداقت کا ثبوت خود اُن کی کتب کے مندرجات کو قرار دیتے ہوئے انہیں اُن کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ نیز آیاتِ قرآنی میں یہ بھی ملتا ہے کہ اہلِ کتاب پیغمبرِ اسلامؐ کو اس طرح بخوبی جانتے تھے جیسے وہ اپنے بچوں سے واقف تھے۔

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ پیغمبر کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔" (سورۂ انعام ۶- آیت ۲۰)

نیز سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۶ میں بھی اسی مضمون کی تکرار ہوئی ہے۔

کتاب سے مراد قرآنِ کریم بھی ہے کیونکہ یہ پیغمبرؐ کے لئے گواہی ہے۔ لہٰذا جو اس بات کو سمجھ لے کہ قرآنِ کریم خدا کا کلام ہے وہ پیغمبرؐ کو بھی پہچان لے گا۔

جہاں تک سوال کے دوسرے جز کی بات رہی کہ کتاب سے مراد کُل کتاب ہے یا بعض حصے، تو پیغمبرؐ کی شناخت کے لئے نہ تورات و انجیل کی کُل آیات کا علم لازم ہے اور نہ سارے کے سارے قرآنِ کریم کا علم بلکہ پیغمبرؐ کی شناخت کے لئے کتاب کے بعض حصوں سے آشنائی ہی کافی ہے۔

❁

سوال نمبر ۶۱ : پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت کے بعد خلیفۂ اول نے پیغمبر کی وراثت کے

بارے میں یہ حدیث نقل کی کہ "پیغمبر کا تمام ترکہ صدقہ ہے۔" یعنی عام مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ دخترِ پیغمبرؐ حضرت فاطمہ زہراؑ نے اس حدیث کو چند آیات کے برخلاف قرار دیا۔ بتایئے اس سلسلے میں حضرت زہراؑ نے کون سی آیاتِ قرآنی پیش کیں؟

جواب : حضرت فاطمہ زہراؑ نے خلیفۂ اول کی وضع کی ہوئی اس حدیث کو مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی کے ذریعہ غلط قرار دیا۔

"تمہارے اوپر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت سامنے آجائے تو اگر کوئی مال چھوڑا ہے تو اپنے ماں باپ اور قرابتداروں کے لئے وصیت کردے، یہ صاحبانِ تقویٰ پر ایک طرح کا حق ہے۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۱۸۰)

"اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا۔ اب اگر لڑکیاں دو سے زائد ہیں تو انہیں تمام ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا اور اگر ایک ہی ہے تو اسے آدھا اور مرنے والے کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے۔ اگر اولاد بھی ہو اور اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوں تو ماں کے لئے ایک تہائی ہے اور اگر بھائی بھی ہوں تو ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے۔" (سورۂ نساء ۴- آیت ۱۱)

"اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔" (سورۂ انفال ۸- آیت ۷۵)

"(اے میرے پروردگار) مجھے ایک ایسا ولی اور وارث عطا فرما دے جو

میرا اور آلِ یعقوب کا وارث ہو۔" (سورۂ مریم ۱۹- آیت ۶۰۵)

"اور پھر سلیمان داؤد کے وارث ہوئے۔" (سورۂ نمل ۲۷- آیت ۱۶)

صدیقۂ طاہرہؑ نے ان آیات سے ان الفاظ میں استدلال فرمایا۔

"تعجب ہے تم یہ خیال کرتے ہو کہ خداوندِ عالم نے ہمارے لئے کوئی میراث قرار نہیں دی ہے اور ہمیں پیغمبرِ اکرمؐ کی میراث نہیں ملے گی۔

"کیا تم جاہلیت کے احکام کی پیروی کر رہے ہو؟ یقین کرنے والوں کے لئے خدا سے بہتر کس کا فیصلہ ہے؟"

کیا تم ان مسائل کو نہیں جانتے؟

ہاں تم جانتے ہو۔ سورج کی طرح تمہارے لئے روشن ہے کہ میں ان کی بیٹی ہوں۔

اے مسلمانو! کیا میری میراث زبردستی لے لی جائے گی۔ اے قحافہ کے بیٹے مجھے جواب دو۔ کیا قرآن میں ہے کہ تم کو تو اپنے باپ کی میراث ملے اور مجھے اپنے باپ کی میراث نہ ملے؟ کتنی غلط ہے یہ بات۔ کیا تم نے جان بوجھ کر خدا کی کتاب چھوڑ دی ہے اور اس کو پسِ پشت ڈال دیا ہے؟ درآں حالیکہ قرآن میں ہے کہ۔

"سلیمان کو (اپنے والد) داؤد کی میراث ملی۔"

جناب یحییٰ بن زکریا کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ۔

"خدایا! مجھے ایک ایسا فرزند عطا کر جو میرا اور آلِ یعقوب کا وارث ہو۔"

نیز یہ بھی ارشاد فرمایا۔

"رشتہ دار میراث لینے میں غیروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔"

یہ بھی ارشاد فرمایا۔

"خداوندِ عالم تمہیں تمہارے فرزندوں کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ لڑکوں کا حصہ لڑکیوں سے دوگنا ہے۔"

یہ بھی ارشاد ہے۔

"اگر کوئی اپنے بعد مال چھوڑے تو مناسب ہے کہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لئے وصیت کرے اور یہ تمام پرہیزگاروں کے لئے ضروری ہے۔"

تم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ مجھے اپنے والد کی میراث نہیں ملے گی؟ میرے اور ان کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں ہے؟

کیا خداوندِ عالم نے تمہارے لئے کوئی خاص آیت نازل کی ہے اور میرے والد کو اس سے خارج کیا ہے؟"

❁

سوال نمبر ۶۲ : علمائے تشیع شیعوں کو سختی کے ساتھ خمس کی ادائیگی کی تاکید کرتے ہیں۔ جب کہ قرآنِ کریم کی ایک دو سے زائد آیات میں خمس کا تذکرہ نہیں (اور اس بارے میں جس مصداق کا ذکر کیا جاتا ہے وہ بھی مجہول ہے۔) اس کے برعکس بکثرت آیاتِ قرآنی زکات کی ادائیگی کے حکم پر مشتمل ہیں پھر بھی ہمارے یہاں زکات کی ادائیگی کے بارے میں اس قدر تاکید نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب : جی ہاں ! بکثرت آیاتِ قرآنی کے ساتھ ساتھ احادیث و روایات

اور آرائے فقہا بھی زکات کی انتہائی اہمیت کی گواہ ہیں۔ لیکن اس حکم کو نظر انداز کرنے اور اس کے سلسلے میں تساہل برتنے کی وجوہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ زکات پر خمس کو ترجیح دینے کی توجیہ سے ہم عاجز ہیں۔ کیونکہ ان دونوں مدوں کا تعلق اسلامی اقتصادیات سے ہے اس لئے ہم اسی کی روشنی میں جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

بیت المال میں حسبِ ذیل ذرائع سے آمدنیات حاصل کی جاتی ہیں۔

(۱) زکات، (۲) خمس، (۳) انفال، (۴) خراج، (۵) جزیہ۔

پیغمبر یا امامؑ ان آمدنیات کی وصولی اور تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ جب تک اسلامی حکومت باقی رہی حتی المقدور ان آمدنیات کی وصولی پر مسلمان حکمرانوں کی توجہ رہی۔ لیکن اسلامی حکومتوں کے زوال کے بعد جزیہ اور خراج کی وصولیابی از خود ختم ہوگئی۔ کیونکہ حکومتِ اسلامی ہی غیر مسلم اقلیتوں سے جزیہ اور مفتوح العنواء سرزمینوں میں بسنے والوں سے خراج وصول کرتی تھیں۔

جزیہ، خراج اور انفال کی وصولیابی حکومتوں ہی کے لئے ممکن ہے۔ وہی انہیں جمع اور خرچ کرسکتی ہیں، ممکن ہے کسی زمانے میں کوئی سرزمین مفتوح العنواء نہ رہے، یا اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ علاقوں میں کوئی غیر مسلم اقلیت نہ رہے، اس صورت میں خراج اور جزیہ کی وصولیابی ختم ہوجائے گی۔ لیکن زکات کا تعلق ہر مسلمان سے ہے اور انفرادی طور پر کیونکہ ہر مسلمان پر نماز، روزے اور حج کی مانند زکات کی ادائیگی واجب ہے، اس لئے حکومتِ اسلامی ہو یا نہ ہو ہر مسلمان زکات نکالنے کا پابند ہے۔ گو بنیادی طور پر اس کی وصولی اور معین مصارف میں اس کا خرچ حکومتِ اسلامی ہی کے ذمہ ہے اور پیغمبرِ اکرمؐ

سے لے کر خلفائے راشدین تک اور ان کے بعد اموی اور عباسی خلفاء بھی بڑی شدومد کے ساتھ زکات کی وصولیابی پر زور دیتے تھے۔

کیونکہ زکات کی اہمیت اور ثواب کا قرآن و حدیث میں بہ تکرار انتہائی تاکید کے ساتھ ذکر ہوا ہے اس لئے حکومتِ اسلامی کے خاتمے کے بعد بھی لوگ انفرادی طور پر اس کو نکالنے کا اہتمام کرتے رہے اور یہ رسم اب بھی مسلمانوں میں باقی ہے اور اس کی باقاعدہ حکومتی سطح پر وصولی اور تقسیم کا اہتمام نہ ہونے کے باوجود مسلمان اسے باقاعدگی سے نکالنے اور مستحقین تک پہنچانے کا بندوبست کرتے ہیں۔

خمس دورِ پیغمبرؐ میں غنائم پر لیا جاتا تھا۔ مسلّم الثبوت بات یہی ہے۔ خمس ذاتی کمائی پر لیا جاتا تھا یا نہیں، اس میں شک و تردید پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں بعض کا نظریہ یہ ہے کہ جب ہمارے ائمہ معصومینؑ نے نظامِ زکات کو ظالم اور ستمگر حکمرانوں کے قبضے میں دیکھا اور خاص کر اس موقع پر جب کہ شیعوں کے نام بیت المال کی تقسیم کے دفتر سے کاٹ دیئے جاتے تھے، ائمہؑ نے اپنا حقِ ولایت استعمال کرتے ہوئے ذاتی آمدنیات پر خمس کو بھی واجب قرار دیا۔

ہمارے خیال میں خمس کے وجوب کا یہ حکم بھی ائمہؑ مخفی طور پر بیان کیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس کے فاش ہونے کی صورت میں حکمرانوں کی طرف سے مزاحمت کا خطرہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی طرح یہ بات حکمرانوں کے علم میں آگئی تو وہ وقتاً فوقتاً ائمہؑ سے خمس کی وصولیابی کے سلسلے میں بازپرس کیا کرتے تھے اور بارہا انہوں نے ائمہؑ پر اس بہانے سے گرفت کی کوشش کی۔ جب ائمہؑ کو اس سلسلے میں زیادہ مشکلات کا سامنا ہوا تو انہوں نے یہ حکم بھی صادر کیا کہ ہم

نے خمس کو اپنے شیعوں پر مباح قرار دیا ہے۔ یعنی خمس خود لینے سے انکار کیا اور کہا کہ لوگ از خود اسے مستحقین پر خرچ کریں۔

اگرچہ زکات بھی ائمہ معصومینؑ ہی کا حق ہے، لیکن آپؑ نے یہ کھلم کھلا اس لئے وصول نہ کی کہ اس صورت میں حکومتوں سے تصادم کا خطرہ تھا۔

یہ ہے وہ پس منظر جس کی وجہ سے شیعوں کے یہاں زکات کی بجائے خمس کو اہمیت حاصل ہوئی اور اس کے نتیجے میں شیعہ فقہا نے اس میدان میں اس قدر تحقیق و کاوشیں کیں کہ پھلوں کی گٹھلیوں تک پر خمس کو واجب قرار دیا لیکن وہ کروڑوں کی آمدنیات جن پر زکات واجب ہونا چاہئے زکات کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے ان کی زکات نہیں نکالی جاتی۔ اس نظرانداز کی بناء پر سرمایہ داروں اور مالداروں سے زکات کی مد میں رقوم وصول نہیں ہو پاتیں جس کی وجہ سے شیعہ مستحقین محروم رہتے ہیں۔

❁

سوال نمبر۶۳ : قرآنِ کریم کی بعض آیات مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتی ہیں۔ جب کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ امت کا اختلاف رحمت ہے۔ آپ اس تضاد کی کیا توجیہ کریں گے؟

جواب : اختلاف کے متعدد معنی ہیں جب اس کے معنی ٹکراؤ اور تضاد لئے جاتے ہیں تو سیاسی اور اجتماعی امور میں اس ٹکراؤ اور تضاد کی قرآنِ کریم مذمت کرتا ہے اور امتِ مسلمہ کی حیثیت سے تمام مسلمانوں کو شیرازہ بندی کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن اگر یہ اختلاف فکری میدان میں ہو تو اسے رحمت قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اگر افکار میں اختلاف نہ ہو تو یہ فکری جمود کی علامت ہے، جب کہ فکروں

کا اختلاف ذہنی صلاحیتوں کو رشد و نمو دیتا ہے۔

نیز اگر اختلاف کے ایک دوسرے معنی یعنی آپس میں میل ملاپ اور ایک دوسرے کے یہاں آمد و رفت مراد لئے جائیں تو یہ بھی رحمت ہے اور خداوندِ عالم اس عمل کی تاکید کرتا ہے۔

❁

سوال نمبر۶۴ : قرآنِ کریم میں مردوں سے کہا گیا ہے کہ وہ دو، تین یا چار تک شادیاں کرسکتے ہیں۔ لیکن اگر ان (بیویوں) کے درمیان عدالت نہ برت سکیں تو ایک ہی پر اکتفا کریں۔ جب کہ ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تم (ان کے درمیان) یقیناً عدالت نہ کرسکو گے۔" (سورۂ نساء۴۔ آیت۱۲۹)

واضح کیجئے کہ مردوں کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دینے اور پھر یہ کہنے کہ ان کے درمیان یقیناً عدالت نہ کرسکو گے کیا ربط قائم کیا جاسکتا ہے؟

جواب : ارشادِ رب العزت ہے۔

"جو عورتیں تمہیں پسند ہیں دو، تین، چار ان سے نکاح کرلو اور اگر ان میں بھی انصاف نہ کرسکنے کا خطرہ ہو تو پھر صرف ایک بیوی کرو۔"

(سورۂ نساء۴۔ آیت۳)

ایک دوسرے مقام پر ارشادِ الٰہی ہے۔

"اور کتنا ہی کیوں نہ چاہو عورتوں کے درمیان مکمل انصاف نہیں کرسکتے ہو۔" (سورۂ نساء۴۔ آیت۱۲۹)

پہلی آیت میں جہاں مردوں کو ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کو انصاف کرسکنے سے مشروط کیا گیا ہے وہاں ہم بستری اور نان و نفقہ کے بارے میں انصاف

کی شرط رکھی گئی ہے۔ یعنی اگر کوئی ان امور میں انصاف نہ برت سکے تو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ لیکن دوسری آیت جس میں کہا گیا ہے کہ "کتنا ہی کیوں نہ چاہو عورتوں کے درمیان انصاف نہ کرسکوگے۔" وہاں مراد قلبی میلان ہے۔ یعنی انسان ایک سے زیادہ بیویوں کے ہوتے ہوئے ہر ایک کی جانب یکساں قلبی میلان نہیں رکھ سکتا۔

نتیجہ

سورۂ نساء کی آیت نمبر۴ میں مردوں کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن اسے جماع اور نان و نفقہ میں عدالت برتنے سے مشروط کیا گیا ہے اور ایسی عدالت برتنا محال نہیں۔ لیکن اسی سورے کی آیت نمبر۱۲۹ میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ عدالت نہ برت سکوگے۔ وہ قلبی میلان کے بارے میں عدالت ہے اور یہ بظاہر محال نظر آتا ہے کہ انسان اپنی ایک سے زیادہ بیویوں میں سے ہر ایک کی جانب یکساں قلبی میلان رکھے خواہ وہ کتنا ہی صالح و پاکباز کیوں نہ ہو۔

لہٰذا یہ عدالت جس کا برتنا محال نظر آتا ہے اسے شرط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شرط وہی فقہی عدالت ہے۔ اگر کوئی اسے قائم رکھ سکے تو اسے ایک سے زائد شادیوں کی اجازت ہے۔

❁

سوال نمبر۶۵ : خداوندِ عالم نے حضرت آدمؑ کو خلق کرتے وقت انہیں خلافت و جانشینی کے اعزاز سے نوازا۔ بتایئے کس کی خلافت و جانشینی عطا کی؟

(الف) کیا حضرت آدم اپنے پیشروؤں کے جانشین ہیں؟

(ب) کیا خداوندِ عالم کے جانشین ہیں؟ اگر خداوندِ عالم کے جانشین ہیں تو۔

(i) کیا عبودیت میں جانشین ہیں کہ لوگ انہیں بھی سجدہ کریں؟

(ii) یا خدا کی حکومت کے زمین پر نفاذ کے لئے جانشین ہیں؟

(iii) کیا زمین کی آبادکاری کے لئے جانشینِ الٰہی ہیں؟

جواب : سوال میں اٹھائے گئے نکات ہی کی روشنی میں جواب حاضر ہے۔

(الف) جی ہاں ! حضرت آدمؑ اپنے پیشروؤں کے جانشین ہیں جو ان سے قبل زمین پر موجود تھے اور کیونکہ فرشتے جانتے تھے کہ آدم کے پیشروؤں نے زمین پر فساد بپا کیا تھا' اسی لئے انہوں نے خدا سے ان کے بارے میں کہا تھا کہ یہ تو زمین پر فساد پھیلائے گا۔

(ب) جہاں تک خداوندِ عالم کی جانشینی کا تعلق ہے تو وہ اس مفہوم میں تو ناممکن ہے جو انسانوں کے حوالے سے ہوتا ہے کہ کسی کے فوت ہوجانے' یا معذور ہوجانے' یا غیر حاضر ہونے کی صورت میں کوئی اس کا جانشین ہوجاتا ہے کیونکہ اس قسم کے امکان خداوندِ عالم سے محال ہیں۔

آدمؑ عبودیت میں بھی خداوندِ متعال کے جانشین نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ بندوں کو جو عبودیت اللہ سبحانہ کے لئے انجام دینا ہے وہ بندوں کے لئے انجام نہیں دے سکتے اور یہ انتقالِ الوہیت کہلائے گا جو شرک کے زمرے میں ہے۔

آدمؑ زمین کی آبادکاری کے لئے بھی خدا کے جانشین نہیں۔ کیونکہ یہ جانشینی تو تمام انسانوں کو حاصل ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے۔

"وھو الذی جعلکم خلائف الارض"

"وہی وہ خدا ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا۔"

اور اس کے لئے یہاں لفظ خلائف استعمال ہوا ہے جب کہ حضرت آدمؑ کے بارے میں لفظ خلیفہ استعمال ہوا ہے۔

ہاں، دراصل حضرت آدمؑ کی جانشینی زمین پر خدا کی حاکمیت کے نفاذ کے سلسلے میں ہے۔ جیسا کہ حضرت داؤدؑ کے سلسلے میں ارشادِ الٰہی ہے۔

"یا داؤد انا جعلناک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوٰی فیضلک عن سبیل اللّٰہ"

"اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے۔ لہٰذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہشات کی اتباع نہ کرو کہ وہ راہِ خدا سے منحرف کردیں۔" (سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۲۶)

❁

سوال نمبر ۶۶ : عقائد کے سلسلے کی ایک پیچیدہ بحث "قضا و قدر" کی بحث ہے۔ "قضا" اور "قدر" دونوں الفاظ قرآنِ کریم کی کئی آیات میں آئے ہیں۔ بتایئے کہ۔

(الف) لفظ "قضا" قرآنِ کریم میں کتنے معنی میں استعمال ہوا ہے؟

(ب) لفظ "قدر" قرآنِ کریم میں کتنے معنی میں آیا ہے؟

جواب : لفظ "قضا" قرآنِ کریم میں حسبِ ذیل معنی میں آیا ہے۔

(۱) حکم و فیصلے کے معنی میں : سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۲۳، سورۂ نساء ۴۔ آیت ۶۵، سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۶۔

(۲) تمام اور پورے ہونے کے معنی میں : سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۲۹، سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۰۰، سورۂ کہف ۱۸۔ آیت ۷۷۔

(۳) خلق کرنے اور پیدا کرنے کے معنی میں : سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۱۲۔

(۴) ارادے کے معنی میں : سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۱۷۔

(۵) خبر دینے اور اعلان کرنے کے معنی میں : سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۶۶، سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۴۔

(۶) فعل کے معنی میں : سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۷۲۔ (اس آیت میں پہلی مرتبہ استعمال ہونے والا قضا مذکورہ معنی میں ہے۔)

(۷) فیصلے کے معنی میں : سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۱۵، سورۂ سباء ۳۴۔ آیت ۱۴، سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۷۷۔

لفظ "قدر" قرآنِ کریم میں درجِ ذیل معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۱) قدر ضیق و تنگ کے معنی میں : سورۂ فجر ۸۹۔ آیت ۱۶، سورۂ انبیاء ۲۱۔ آیت ۸۷، سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۲۶، سورۂ طلاق ۶۵۔ آیت ۷، سورۂ عنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۲، سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۳۰، سورۂ روم ۳۰۔ آیت ۳۷، سورۂ سباء ۳۴۔ آیت ۳۶۔

(۲) قدر پہچان و شناس، قدردانی، عزت و احترام کے معنی میں : سورۂ انعام ۶۔ آیت ۹۱، سورۂ قدر ۹۷۔ آیت ۱۔

(۳) قدر قدرت و توانائی کے معنی میں : سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۷۵-۷۶، سورۂ انعام ۶۔ آیت ۳۷ اور ۶۵، سورۂ احقاق ۴۶۔ آیت ۳۳، سورۂ قیامت ۷۵۔ آیت ۴۰، سورۂ معارج ۷۰۔ آیت ۶۰۔

(۴) قدر اندازے کے معنی میں : سورۂ قصص ۲۸- آیت ۸۲، سورۂ قمر ۵۴- آیت ۱۲، سورۂ فصلت ۴۱- آیت ۱۰، سورۂ اعلیٰ ۸۷- آیت ۳، سورۂ سبا ۳۶- آیت ۱۸، سورۂ واقعہ ۵۶- آیت ۶۰، سورۂ یٰسین ۳۶- آیت ۳۹، سورۂ یونس ۱۰- آیت ۵، سورۂ مزمل ۷۳- آیت ۲۰-

❁

سوال نمبر ۶۷ : بعض آیاتِ قرآنی امانت داری اور ذمہ داری اٹھانے کی تعریف کرتی ہیں۔ جب کہ ایک آیت میں بارِ امانت اٹھالینے پر انسان کی مذمت کی گئی ہے اور اس بنا پر اسے جاہل قرار دیا گیا ہے۔(سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۷۲)

بتایئے یہ امانت اٹھالینا کس طرح قابلِ مذمت اور جہالت کی علامت ہے؟

جواب : قرآنِ کریم کی آیات میں ان انسانوں کی تعریف کی گئی ہے جو امانتدار اور اپنے عہد کے پابند ہوتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے :

"اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھنے والے ہیں۔"

(سورۂ مومنون ۲۳- آیت ۸)

"اور جو اپنی امانتوں اور عہد کا خیال رکھنے والے ہیں۔"

(سورۂ معارج ۷۰- آیت ۳۲)

اسی طرح قرآنِ کریم امانتداری کی تاکید بھی کرتا ہے۔ ارشادِ رب العزت ہے :

"بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانت کو ان کے اہل تک پہنچادو۔" (سورۂ نساء ۴- آیت ۵۸)

اس کے برعکس بعض آیاتِ قرآن میں انسان کے بارِ امانت اٹھالینے کی مذمت کی گئی ہے اور اسے اس کے جہل اور ظلم کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

"بے شک ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف ظاہر کیا بس انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا کہ انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے۔"

(سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۷۲)

حمل کے لغوی معنی اٹھانے کے ہیں (لسان العرب ج ۱۱- ص ۱۷۵) نیز متعدد آیاتِ قرآنی میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۴۸، سورۂ انعام ۶- آیت ۳۱، سورۂ ہود ۱۱- آیت ۴۱، سورۂ رعد ۱۳- آیت ۸، سورۂ نحل ۱۶- آیت ۷ اور ۲۵، سورۂ مریم ۱۹- آیت ۲۷، سورۂ طٰہٰ ۲۰- آیت ۱۰۰ اور ۱۰۱، سورۂ عنکبوت ۲۹- آیت ۶۰، سورۂ فاطر ۳۵- آیت ۱۱، سورۂ فصلت ۴۱- آیت ۴۷، سورۂ جمعہ ۶۲- آیت ۵، سورۂ حاقہ ۶۹- آیت ۱۴ اور ۱۷-)

حمل یا اٹھانا ایک طرف ممدوح و قابلِ ستائش ہے اور ایک طرف مذموم و قابلِ مذمت، کبھی حمل مستحب ہوتا ہے، کبھی واجب اور کبھی حرام۔

جہاں تک حملِ امانت یعنی امانت کا بار اٹھانے کی بات ہے تو یہ اسی صورت میں ممدوح ہے جب امانت اٹھانے کے بعد اسے حفاظت کے ساتھ لوٹا دیا جائے۔ لہٰذا امانت اٹھانا اہم نہیں بلکہ امانت کی ادائیگی اہم ہے۔ اگر کوئی کسی کی سپرد کی ہوئی امانت کو نہ لوٹائے تو اسے خیانت کہتے ہیں۔ جیساکہ صاحبِ مجمع البحرین نے اس آیت میں "حملِ امانت" کے معنی امانت میں خیانت لئے ہیں۔

سورۂ احزاب کی آیت ۷۲ میں جس خدائی امانت کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد

خدا کی طرف سے اپنی مخلوقات کو سپرد کی گئی تکلیف و ذمہ داری ہے۔ تمام مخلوقات نے اس امانت کو خدا سے لینے کے بعد ادا کیا ہے لیکن صرف انسان نے خدا کی سپرد کردہ امانت کو لوٹایا نہیں ہے، یعنی اس پر جو فرائض و ذمہ داریاں رب العالمین کی جانب سے عائد کی گئی ہیں انہیں اس نے ادا نہیں کیا اس کی یہ خیانت قابلِ مذمت ہے۔

❁

سوال نمبر۶۸ : خداوندِ عالم نے نبی کی شناخت کا ایک طریقہ معجزے کو قرار دیا ہے، کیونکہ معجزہ ایک غیر معمولی عمل ہے جو ہر شخص سے صادر نہیں ہو سکتا۔ لیکن سحر اور جادو بھی تو ایک غیر معمولی عمل ہے۔

بتایئے سحر و جادو کو معجزے سے کیسے علیحدہ پہچانا جا سکتا ہے؟

جواب : معجزے اور جادو میں فرق کی غرض سے ہم ذیل میں معجزے اور سحر و جادو کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

معجزہ

(۱) معجزہ مبنی بر حقیقت ہوتا ہے یعنی خارج میں بھی وقوع پذیر ہوتا ہے۔

(۲) معجزہ رونما کرنے والا بغیر کسی تعلیم و تربیت اور مشق و ریاضت کے اسے رونما کرتا ہے۔

(۳) معجزہ رونما کرنے والا اس کو انجام دینے سے پہلے کوئی عمل، کوئی ورد نہیں کرتا۔

(۴) معجزہ کسی دعویٰ کے اثبات کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً دعویٰ نبوت کو ثابت

کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

(۵) معجزہ دراصل فعلِ خدا ہے جو انبیاءؑ کے ذریعے صادر ہوتا ہے۔

جب کہ سحر

(۱) سحر خارج میں وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ نظر بندی کے نتیجے میں ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرعون کے جادوگروں کے سحر کے بارے میں قرآن میں ہے کہ۔

"ان لوگوں نے رسیاں پھینکیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں خوفزدہ کر دیا اور بہت بڑے جادو کا مظاہرہ کیا۔"

(سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۱۶)

"موسیٰ نے کہا کہ نہیں تم ابتداء کرو، ایک مرتبہ کیا دیکھا کہ ان کی رسیاں اور لکڑیاں جادو کی بنا پر ایسی لگنے لگیں جیسے سب دوڑ رہی ہوں۔" (سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۶۶)

(۲) سحر و جادو کو سکھایا اور سیکھا جا سکتا ہے جب کہ معجزے کو سیکھایا سکھایا نہیں جا سکتا بلکہ خدا کے ارادے سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۳) جادوگر اور ساحر، جادو انجام دینے سے پہلے کوئی عمل یا ورد کرتا ہے۔

(۴) معجزہ مغلوب نہیں کیا جا سکتا جب کہ سحر و جادو مغلوب ہو جاتا ہے۔

(۵) معجزہ جھوٹے اور فاسق انسانوں سے صادر نہیں ہو سکتا، جب کہ جادو کے لئے ایمان اور صداقت شرط نہیں ہے۔

❁

سوال نمبر۶۹ : انسانی بدن کے مختلف اعضاء کو علیحدہ علیحدہ پرندوں اور درندوں کی غذا بنتے دیکھ کر خدا کے ایک نبی کو اندیشہ لاحق ہوا کہ خدا ان اجزاء کو کیونکر جمع کر سکتا ہے؟ بتایئے یہ کون سے پیغمبر کا قصہ ہے اور نبی کے اس شبہ کو خدا نے کیسے زائل کیا؟

جواب : اس قصے کا تعلق خدا کے پیغمبر حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر۲۶۰ میں اس واقعے کا ذکر ملتا ہے اور پیغمبر کے اس شبہ کو زائل کرنے کے سلسلے میں بھی اسی آیت میں مذکور ہے۔

"اور اس موقع کو یاد کرو جب ابراہیم نے التجا کی کہ پروردگار مجھے یہ دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوا کیا تمہارا ایمان نہیں ہے۔ عرض کی ایمان تو ہے لیکن اطمینان چاہتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ چار پرندے پکڑ لو اور انہیں اپنے سے مانوس بناؤ پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑ پر ایک حصہ رکھ دو اور پھر آواز دو سب دوڑتے ہوئے آجائیں گے۔ اور یاد رکھو کہ خدا صاحبِ عزت بھی ہے اور صاحبِ حکمت بھی۔" (سورۂ بقرہ۲۔ آیت۲۶۰)

❁

سوال نمبر۷۰ : آج دنیا میں ظلم و ستم، بربریت و فسطائیت کا دور دورہ ہے۔ بعض لوگ ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں، بعض اسکے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ادیانِ سماوی خصوصاً دینِ اسلام بشریت کو مستقبل میں اس ظلم سے نجات پانے کی خوشخبری دیتا ہے۔ بتایئے قرآن کی کونسی آیت ایسے دن کی خبر دیتی ہے؟

جواب : متعدد آیاتِ قرآن روئے زمین پر اسلام کے غلبے، محروموں اور مظلوموں کی فتح اور خدا کے پسندیدہ بندوں کی حکومت کی خبر پر مشتمل ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) دینِ اسلام غالب ہوگا : سورۂ توبہ۹۔ آیت۳۳، سورۂ فتح۴۸۔ آیت۲۸، سورۂ صف۶۱۔ آیت۹۔

(۲) مظلوم و محروم غالب ہوں گے : سورۂ قصص۲۸۔ آیت۵۔

(۳) مومنین کی حکومت ہوگی : سورۂ نور۲۴۔ آیت۵۵، سورۂ انبیاء۲۱۔ آیت۱۰۵۔

(۴) پیغمبرؐ کی رحمت تمام عالم پر چھائے گی : سورۂ انبیاء۲۱۔ آیت۱۰۷۔

❁

سوال نمبر۷۱ : دنیائے عیسائیت کہتی ہے کہ حضرت مسیح فوت ہو چکے ہیں۔ جب کہ قرآنِ کریم کا کہنا ہے کہ عیسیٰ مسیح زندہ ہیں۔ بتایئے قرآن کی کون کون سی آیات حضرت عیسیٰؑ کے زندہ ہونے کی خبر دیتی ہیں؟

جواب : مسیحیوں کے اس دعویٰ کو کئی طرح سے رد کیا جا سکتا ہے مثلاً۔

(۱) عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھایا گیا اور ان کی موت واقع ہوئی۔ لیکن سورۂ نساء کی آیت۱۵۷ میں حضرت عیسیٰؑ کے قتل اور ان کے سولی پر چڑھائے جانے کو رد کیا گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے :

"اور یہ کہنے کی بناء پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے حالانکہ نہ انہوں نے انہیں قتل کیا ہے اور نہ سولی دی ہے

بلکہ دوسرے کو ان کی شبیہ بنا دیا گیا تھا اور جن لوگوں نے عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ سب منزلِ شک میں ہیں اور کسی کو گمان کی پیروی کے علاوہ کوئی علم نہیں ہے اور انہوں نے یقیناً انہیں قتل نہیں کیا ہے بلکہ خدا نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا ہے اور خدا صاحبِ غلبہ اور صاحبِ حکمت بھی ہے۔" (سورۂ نساء ۴- آیت ۱۵۷-۱۵۸)

(۲) ارشادِ رب العزت ہے۔

"اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے (حضرت عیسیٰ) پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے دن عیسیٰ اس کے گواہ ہوں گے۔" (سورۂ نساء ۴- آیت ۱۵۹)

یہ آیۂ کریمہ تمام اہلِ کتاب کے حضرت عیسیٰ مسیح پر ایمان لانے کی خبر دے رہی ہے جب کہ اب تک تمام اہلِ کتاب ان پر ایمان نہیں لائے۔ لہٰذا آپؑ زندہ ہیں اور اس وقت تک نہ مریں گے جب تک سب اہلِ کتاب ان پر ایمان نہ لے آئیں۔

❁

سوال نمبر ۲۷ : ہم مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہمارے پیغمبرؐ کی رسالت عالمی ہے۔ یعنی زمان و مکان کی حدود میں سمانے والی نہیں، بتایئے وہ کونسی آیات ہیں جن کے ذریعے ہم اپنے پیغمبرؐ کی رسالت کے عالمی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؟

جواب : اس سوال کے جواب میں جو آیات پیش کی جاسکتی ہیں ان میں ایک طرف تو وہ آیات ہیں جو صریح طور پر تمام ادیان پر پیغمبرِ اسلامؐ کے دین کے غالب ہونے کی خبر دیتی ہیں اور دوسری طرف ان آیات کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے جو پیغمبرِ

اسلامؐ کی کتاب کے عالمی اور دائمی ہونے کی خبر پر مشتمل ہیں۔

○ جو آیات پیغمبرِ اسلامؐ کے دین کے غلبے کی خبر دیتی ہیں وہ یہ ہیں۔

"هو الذی ارسل رسوله بالهدٰی و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون"

"وہ خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب بنائے چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔" (سورۂ توبہ ۹- آیت ۳۳)

تقریباً یہی مضمون سورۂ فتح ۴۸- آیت ۲۸ اور سورۂ صف ۶۱- آیت ۹ میں بھی آیا ہے۔

○ وہ آیات جو رہتی دنیا تک پیغمبر کی کتاب کے غالب ہونے کی خبر دیتی ہیں اور اس جیسی کوئی اور کتاب لانے کا چیلنج دیتی ہیں وہ یہ ہیں۔

"وان کنتم فی ریب مما نزلنا علٰی عبدنا فاتوا بسورة من مثله وادعوا شهداءکم من دون الله ان کنتم صادقین"

"اگر تمہیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کا جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جتنے تمہارے مددگار ہیں سب کو بلالو اگر تم اپنے وعدے اور خیال میں سچے ہو۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۳)

اسی مضمون سے ملتی جلتی آیات سورۂ یونس ۱۰- آیت ۳۸ اور سورۂ ہود ۱۱- آیت ۱۳ بھی ہیں۔

سوال نمبر۷۳ : خداوندِ عالم قرآنِ کریم میں پیغمبرؐ پر احسان جتاتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے آپؐ کو قرآن کے ساتھ "مثانی" عطا کیا ہے۔ بتایئے یہ بات قرآن کی کس آیت میں بیان کی گئی ہے اور "مثانی" کے کیا معنی ہیں؟

جواب : سورۂ حجر کی آیت ۸۷ میں "مثانی" کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"اور ہم نے آپ کو سبع مثانی اور قرآنِ عظیم عطا کیا ہے۔"

(سورۂ حجر ۱۵- آیت ۸۷)

مثانی سے مراد سورۂ حمد ہے۔ اس کو مثانی اس لئے کہتے ہیں کہ مثانی کے معنی دو یا دُہرا کے ہیں اور سورۂ حمد دو مرتبہ نازل ہوئی ہے۔ دُہرے مطالب پر حاوی ہے۔ اس کے نصف میں خدا کا ذکر ہے اور نصف میں بندے کا ذکر۔ اس میں وعدے اور وعید دونوں پر مشتمل آیات ہیں، جہاں اس میں بشارت دی گئی ہے وہیں انذار بھی کیا گیا ہے۔

❁

سوال نمبر۷۴ : خداوندِ عالم نے دنیا میں انسانوں کو جو کچھ عطا کیا ہے وہ ان کی ملکیت نہیں بلکہ سرپرستی اور نگہداری کی حد تک ان کے حوالے کیا گیا ہے۔ بتایئے یہ بات کس آیتِ قرآن میں بیان ہوئی ہے؟

جواب : اس مضمون کو درجِ ذیل آیت بیان کرتی ہے۔

"تم لوگ اللہ و رسول پر ایمان لے آؤ اور اس مال میں سے خرچ کرو جس میں اس نے تمہیں اپنا نائب قرار دیا ہے۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے راہِ خدا میں خرچ کیا ان کے لئے اجرِ عظیم ہے۔" (سورۂ حدید ۵۷- آیت ۷)

سوال نمبر۷۵ : قرآنِ کریم حکومت کی صرف دو اقسام بیان کرتا ہے۔ ایک حکومتِ الٰہی اور دوسری حکومتِ جاہلیت۔ قرآنِ کریم حکومتِ الٰہی کو مسترد کرنے والوں کے چند القاب و خصوصیات بیان کرتا ہے۔ آیات کے حوالے سے بتایئے کہ یہ القاب اور خصوصیات کیا ہیں؟

جواب : قرآنِ کریم سورۂ مائدہ میں حکومتِ جاہلی کو ان الفاظ میں مسترد کرتا ہے۔

"افحکم الجاهلية يبغون و من احسن من الله حكما لقوم يوقنون"

"کیا یہ لوگ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں جب کہ صاحبانِ یقین کے لئے اللہ کے فیصلے سے بہتر کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔" (سورۂ مائدہ ۵- آیت ۵۰)

اور اسی سورۂ مبارکہ میں حکومتِ الٰہی کو مسترد کرنے والوں کے درجِ ذیل القاب و خصوصیات بیان کرتا ہے۔

(۱) کافر : "اور جو بھی ہمارے نازل کئے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا وہ سب کافر شمار ہوں گے۔" (سورہ مائدہ ۵- آیت ۴۴)

(۲) ظالم : "اور جو بھی خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ کرے گا وہ ظالموں میں شمار ہوگا۔" (سورۂ مائدہ ۵- آیت ۴۵)

(۳) فاسق : "جو بھی تنزیلِ خدا کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا وہ فاسقوں میں شمار ہوگا۔" (سورۂ مائدہ ۵- آیت ۴۷)

❁

سوال نمبر۷۶ : قرآنِ کریم میں روزِ قیامت انسانوں کے لئے چند گواہوں کا ذکر

ہوا ہے۔ آیت کے حوالے سے بتایئے کہ وہ گواہ کتنے اور کون کون سے ہیں؟

جواب : خداوندِ عالم ایک آیت میں روزِ قیامت گواہوں کے سامنے آنے کا ذکر کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

"بے شک ہم اپنے رسول اور ایمان لانے والوں کی زندگانیٔ دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی مدد کریں گے جب سارے گواہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔" (سورۂ غافر ۴۰۔ آیت ۵۱)

قرآنِ کریم میں روزِ قیامت انسانوں کے لئے جن گواہوں کا ذکر ہوا ہے وہ درجِ ذیل ہیں، ساتھ ہی آیت کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔

(۱) خود اللہ تبارک و تعالیٰ گواہ ہے : سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۹۸، سورۂ یونس ۱۰۔ آیت ۶۱، سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۱۷، سورۂ زمر ۳۹۔ آیت ۷۔

(۲) انبیاء الٰہی گواہ ہوں گے : سورۂ نساء ۴۔ آیت ۴۱، سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۸۹۔

(۳) ائمہ و پیشوایانِ دین گواہ ہوں گے : سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۴۳، سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۰۵۔

(۴) فرشتگانِ رقیب و عتید گواہ ہوں گے : سورۂ ق ۵۔ آیت ۱۷ اور ۲۱، سورۂ انفطار ۸۲۔ آیت ۱۰ اور ۱۱۔

(۵) اعضاء و جوارح گواہ ہوں گے : سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۲۴، سورۂ یٰسین ۳۶۔ آیت ۶۵، سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۲۱ اور ۲۲۔

(۶) زمین و زمان گواہ ہوں گے : سورۂ زلزال ۹۹۔ آیت ۴ اور ۵۔

سوال نمبر ۷۷ : قرآنِ کریم میں خداوندِ عالم نے کبھی نبی کو خلیفہ کہا ہے اور کبھی تمام انسانوں کو۔ کبھی فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو خلیفہ بنایا ہے اور کبھی فرمایا ہے کہ ہم تم کو خلیفہ بنائیں گے۔ بتایئے قرآنِ کریم میں لفظ "خلیفہ" کن معنوں میں استعمال ہوا ہے؟

جواب : خلیفہ خلف سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیچھے رہ جانے اور کسی کا جانشین ہونے کے ہیں۔ کسی بھی گروہ یا شخص کے بعد آنے والے گروہ یا شخص کو اس کا خلیفہ کہتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیاتِ قرآن میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۶۹، سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۱، سورۂ مریم ۱۹۔ آیت ۵۹ اور ۶۴، سورۂ فرقان ۲۵۔ آیت ۶۲، سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۴۲۔

خلیفہ کے ایک معنی اقتدار اور حکومت میں کسی کے جانشین ہونے کے بھی ہیں۔ جیسے سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰، سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۲۹، سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۵۵، سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۲۶ میں ہے۔

❁

سوال نمبر ۷۸ : قرآنِ کریم کی چند آیات میں بندگانِ خدا کو دعا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور استجابتِ دعا کی ضمانت بھی دی گئی ہے اور خدا نے اپنی طرف وعدہ خلافی کی نسبت کو بھی مسترد کیا ہے۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی اس ضمانت کے باوجود بہت سی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ بتایئے اس کا کیا فلسفہ ہے اور کیا قرآن میں استجابتِ دعا کی کچھ شرائط بیان ہوئی ہیں؟

جواب : اس سوال کے جواب کی وضاحت کے لئے چند نکات ذہن میں رکھنے

کی ضرورت ہے۔ جیسے۔

(۱) دعا محض لقلقائے زبانی کا نام نہیں۔ یعنی یہ درست نہیں ہے کہ انسان کا رو کوشش سے ہاتھ کھینچ کر محض زبانی دعا کرتا رہے، بلکہ دعا سنجیدگی کے ساتھ کسی چیز کو طلب کرنے کا نام ہے۔

(۲) بعض آیاتِ قرآن دعا کو رمزِ بندگی شمار کرتی ہیں، حکمِ مولیٰ قرار دیتی ہیں یعنی اسے صرف فریضے کے طور پر انجام دیا جائے نہ کہ اس کے مقابل کچھ طلب کرنا۔ دعا کرنا خود ایک فریضہ ہے، لہٰذا ہمیشہ یہ توقع رکھنا کہ جو دعا مانگی جائے وہ من و عن پوری ہو آدابِ بندگی کے خلاف ہے۔

(۳) انسان اپنے مصالح، مفادات، فوائد و نقصانات سے آگاہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی من پسند چیزیں طلب کرتا ہے۔ جب کہ خدا انسان کی مصلحت اور اس کے لئے ضرر رساں امور سے واقف ہے۔ چنانچہ وہ انسان کی کوئی ایسی خواہش پوری نہیں کرتا جو اس کی مصلحت کے خلاف ہو، جو اس کے لئے نقصان دہ ہو۔

(۴) کائنات خداوندِ عالم کے دیئے ہوئے قوانین پر رواں دواں ہے، لہٰذا خدا ایسی دعا کیسے قبول کر سکتا ہے جو اسی کے بنائے ہوئے قوانین ٹوٹنے پر منتج ہو؟

(۵) خداوندِ عالم کا ارشاد ہے "ادعونی استجب لکم" "مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔" (سورۂ غافر ۴۰- آیت ۶۰) اس طرح اللہ سبحانہ اپنے بندوں سے ان کی دعاؤں کی قبولیت کا وعدہ فرما رہا ہے۔ لیکن کیا دعا کی قبولیت کا یہ وعدہ غیر مشروط ہے؟ یقیناً نہیں۔ اگر یہ وعدہ غیر مشروط ہو تو دنیا میں ہرج مرج، بد نظمی و انتشار پیدا ہو جائے۔ یہ وعدہ مشروط ہے اور اس کی تصدیق اس آیۂ کریمہ سے ہوتی ہے کہ۔

"واوفوا بعهدی اوف بعهدکم"

"اور ہمارے عہد کو پورا کرو ہم تمہارے عہد کو پورا کریں گے۔"

(سورۂ بقرہ ۲- آیت ۴۰)

اور انسانوں کا خدا سے یہ وعدہ ہے کہ ہم شیطان کی اطاعت نہ کریں گے۔

"اولادِ آدم کیا ہم نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا تھا کہ خبردار شیطان کی عبادت نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔"

(سورۂ یٰسین ۳۶- آیت ۶۰)

لہٰذا اگر کوئی بغیر کسی معذوری و مجبوری کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا اپنی خواہشات کے حصول کے لئے دعا گو ہو، اور یہ چاہتا ہو کہ خدا اپنے طبیعی قوانین کو توڑ کر اس کی خواہشات کو پورا کر دے، تو یہ ممکن نہیں کیونکہ خدا کا فرمان ہے کہ۔

"وان لیس للانسان الا ما سعیٰ"

"اور انسان کے لئے صرف اتنا ہی ہے جتنی اس نے کوشش کی ہے۔" (سورۂ نجم ۵۳- آیت ۳۹)

ان نکات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضرور ہے کہ خدا نے دعا کی قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے لیکن ساتھ ہی اسے اس عہد کو پورا کرنے سے مشروط کیا ہے جو خدا کے بندوں نے اس سے کیا ہے۔ یعنی اگر لوگ خدا کے عہد کو پورا کریں گے تو خدا بھی ان سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرے گا اور اس کے وعدوں میں سے ایک دعا کی قبولیت کا وعدہ بھی ہے۔ لیکن کوئی ایسی دعا قبول نہیں کی جائے گی جو خدا کے قوانین تشریعی اور تکوینی کے خلاف ہو، کیوں کہ یہ

قوانین خدا کے وضع کردہ ہیں چنانچہ اس سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ خود اپنے وضع کردہ قوانین کو توڑے گا۔

خدا نے انسان کو کارو کوشش پر اکسایا ہے اور یہ بھی بتادیا ہے کہ وہ جتنی جدوجہد، سعی و کاوش کرے گا اتنا ہی اسے ملے گا۔ لہٰذا اگر کوئی بغیر کسی عذر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے دنیا جہاں کی خواہشوں کا طالب ہو تو ان کا پورا ہونا ممکن نہیں اور بغیر کوشش کے اس کی محض زبانی دعا قبول نہ کی جائے گی۔

بسا اوقات انسان ایسی چیز طلب کرتا ہے جس کے نقصان سے وہ بے خبر ہوتا ہے جب کہ خدا اپنے بے پناہ علم کی بناء پر اس شخص کے لئے اس کے نقصانات سے آگاہ ہوتا ہے، لہٰذا وہ اس کی یہ دعا قبول نہیں کرتا۔

"اور یہ ممکن ہے کہ جسے تم بُرا سمجھتے ہو وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور جسے تم دوست رکھتے ہو وہ بُرا ہو خدا سب کچھ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۱۶)

❁

سوال نمبر ۷۹ : قرآنِ کریم کی دو آیات میں انتہائی تاکید کے ساتھ کہا گیا ہے کہ "راہِ خدا میں مارے جانے والے لوگ زندہ ہیں۔" بتایئے وہ لوگ جن کی موت تو راہِ خدا میں واقع ہوئی ہو لیکن وہ میدانِ جنگ میں نہ مارے گئے ہوں کیا وہ بھی زندہ ہیں؟ قرآنی آیات کی روشنی میں جواب دیجئے۔

جواب : صرف راہِ خدا میں مارے جانے والے لوگ ہی مرنے کے بعد زندہ نہ ہوں گے بلکہ درحقیقت تمام ہی انسان اپنی موت سے لے کر عرصۂ محشر تک کے درمیانی عرصے میں زندہ رہیں گے۔ خواہ وہ مومنین ہوں، خواہ کفار و مشرکین۔ دنیا

سے انتقال کرجانے کے بعد روزِ قیامت تک تمام انسان عالمِ برزخ میں توقف کرتے ہیں۔ عالمِ برزخ اور کفار، منافقین، مشرکین اور مومنین کی موت و حیات کے بارے میں بعض آیاتِ قرآنی میں ذکر ہوا ہے۔ یہ آیات اور ان کی وضاحت پیشِ خدمت ہے۔

عالمِ برزخ کی دلیل پر آیات

ارشادِ الٰہی ہے۔

"یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آگئی تو کہنے لگا کہ پروردگار مجھے پلٹا دے، شاید میں اب کوئی نیک عمل انجام دوں۔ ہرگز نہیں یہ ایک بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے اور ان کے پیچھے عالمِ برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے۔" (سورۂ مومنون ۲۳- آیت ۹۹-۱۰۰)

اس آیہ کریمہ میں موت آنے کے بعد انسان کا یہ کہنا کہ "پروردگار مجھے پلٹا دے شاید اب میں کوئی نیک عمل انجام دوں۔" یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ موت کے بعد انسان زندہ ہوں گے بصورتِ دیگر سوال یہ اٹھے گا کہ وہ لوگ کس جگہ خدا سے یہ بات کہیں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

"وہ آگ جس کے سامنے یہ ہر صبح و شام پیش کئے جاتے ہیں اور جب قیامت برپا ہوگی تو فرشتوں کو حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو بدترین عذاب کی منزل میں کردو۔" (سورۂ غافر ۴۰- آیت ۴۶)

یہ آیت بھی عالمِ برزخ کی تصدیق کرتی ہے، اس آیت میں فرعونیوں کو صبح و

شام آگ کے سامنے پیش کئے جانے کا تذکرہ ہے' جب کہ عالمِ محشر میں صبح و شام کا کوئی تصور نہیں۔ ظاہر ہے وہ عالمِ برزخ ہی ہے جس میں انہیں صبح و شام آگ میں جلایا جائے گا۔ پھر اس کے بعد قیامت کا ذکر بھی یہی بتا رہا ہے کہ فرعون کے ساتھی اس سے قبل عالمِ برزخ میں ہوں گے جہاں انہیں صبح و شام آگ دکھائی جائے گی۔

عالمِ برزخ کے بارے میں کفار و مومنین کا موقف

☆ عالمِ برزخ کے بارے میں کفار کہتے ہیں کہ۔

"یہ تو صرف ایک زندگانیٔ دنیا ہے جہاں ہم مریں گے اور جئیں گے اور دوبارہ زندہ ہونے والے نہیں ہیں۔" (سورۂ مومنون ۲۳- آیت ۳۷)

"اے کاش اس موت ہی نے میرا فیصلہ کر دیا ہوتا۔"

(سورۂ حاقہ ۶۹- آیت ۲۷)

"بے شک یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف پہلی موت ہے اور بس اس کے بعد ہم اٹھائے جانے والے نہیں ہیں اور اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ داداؤں کو قبروں سے اٹھا کر لے آؤ۔"

(سورۂ دخان ۴۴- آیت ۳۴ تا ۳۶)

"وہ لوگ کہیں گے پروردگارا تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندگی عطا کی تو اب ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا ہے تو کیا اس سے بچ نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔" (سورۂ غافر ۴۰- آیت ۱۱)

☆ عالمِ برزخ کے بارے میں مومنین کہتے ہیں۔

"اور پھر صور پھونکا جائے گا تو سب کے سب اپنی قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف چل کھڑے ہوں گے۔ کہیں گے کہ آخر یہ ہمیں ہماری خواب گاہ سے کس نے اٹھا دیا ہے۔"

(سورۂ یٰسین ۳۶- آیت ۵۱-۵۲)

"اور میرے پروردگار کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی یہیں حاضر کر دیا جاتا۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم اب مرنے والے نہیں ہیں۔ سوائے پہلی موت کے اور ہم پر عذاب ہونے والا بھی نہیں ہے۔"

(سورۂ صافات ۳۷- آیت ۵۷ تا ۵۹)

"وہ وہاں ہر قسم کے میوے سکون سے طلب کریں گے اور وہاں پہلی موت کے علاوہ کسی موت کا مزہ نہیں چکھنا ہوگا اور خدا انہیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔" (سورۂ دخان ۴۴- آیت ۵۵-۵۶)

اگر ان آیات کو ترتیب سے پڑھیں تو دیکھیں گے کہ پہلے تو کفار و مشرکین دوبارہ زندہ ہونے کو قبول نہیں کرتے' حیاتِ برزخ کا انکار کرتے ہیں لیکن بعد میں وہ اس بات کو قبول کر کے دو اموات اور دو زندگیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ جب کہ مومنین اپنے اس احساس کا اظہار کرتے ہیں کہ گویا ہم تو ایک ہی موت مرے ہیں' ہمیں تو دوسری موت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومنین عالمِ برزخ میں خدا کی نعمتوں سے اسی طرح لطف اندوز ہو رہے ہوں گے جیسے عالمِ قیامت میں جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ انکے لئے عالمِ برزخ سے عالمِ قیامت میں منتقل ہونا ایسے ہی ہوگا جیسے کسی کا ایک باغ سے نکل کر دوسرے زیادہ بڑے اور خوشنما باغ میں پہنچ جانا۔

الغرض ان آیات سے حیاتِ برزخ بھی ثابت ہوتی ہے اور مومنین، کفار اور مشرکین کا وہاں زندہ ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔

اس بحث میں وضاحت طلب بات یہ ہے کہ آیات میں دو موتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک موت کے متعلق تو سب جانتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں انسان کی روح کے قفسِ عنصری سے پرواز کے نتیجے میں واقع ہوگی۔ اگر انسان کو قبر میں سوال و جواب کے لئے کچھ دیر زندہ کرکے دوبارہ مار دیا جائے گا تو پھر اسے آخرت کے لئے زندہ کرنا پڑے گا۔

اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے تو اس طرح ایک طرف تو حیاتِ برزخ کا انکار کرنا پڑے گا اور دوسرے یوں انسان تین مرتبہ زندہ کیا جائے گا جب کہ قرآنِ کریم صرف دو مرتبہ زندہ کئے جانے اور دو مرتبہ موت کا ذکر کرتا ہے اور جس کی کفار سے تصدیق بھی کرواتا ہے۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ ہم کفار کے قول کو کیسے قبول کرلیں، وہ بھی بھلا درست کہہ سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح ہے کہ کفار دنیا میں جھوٹ بولتے ہیں لیکن آخرت میں لامحالہ وہ سچ ہی بولیں گے اور اس کی تصدیق قرآنِ کریم بھی کرتا ہے۔ "جس دن روح القدس اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے اور کوئی بات بھی نہ کرسکے گا علاوہ اس کے جسے رحمان اجازت دے دے اور ٹھیک ٹھیک بات کرے۔" (سورہ نبا ۷۸- آیت ۳۸)

چنانچہ دو اموات اور دو حیات واقع ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے برزخ میں انسان کی حیات کا قائل ہونا۔ اسی طرح انسان کی دو حیات اور دو ممات سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک موت دنیا سے عالمِ برزخ میں منتقل ہوتے

ہوئے واقع ہوگی اور ایک موت حیات برزخ سے عالم قیامت میں جاتے وقت۔ عالمِ برزخ کی حیات دنیا کی موت کے تابع ہے۔ یعنی دنیا کی موت عالمِ برزخ کی زندگی کو جنم دیتی ہے، انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ حیاتِ برزخ کی موت حیاتِ اخروی کو جنم دیتی ہے۔ یعنی قیامت میں حیات عالمِ برزخ کی موت کے تابع ہے۔

بالالفاظ دیگر موت و حیات ایک ہی وقوعہ کے دو رخ ہیں۔ یعنی جوں ہی انسان اس دنیا میں وفات پاتا ہے عین اسی لمحہ میں وہ عالمِ برزخ میں پیدا ہو رہا ہوتا ہے اور جوں ہی وہ عالم برزخ میں مرے گا اسی لحظہ وہ عالمِ قیامت کے لئے زندہ ہوگا۔

❁

سوال نمبر ۸۰ : کونسی آیت کی رو سے راہِ خدا میں قتل ہونے والوں کو شہید کہا جاتا ہے؟

جواب : قرآنِ کریم کی کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس میں راہِ خدا میں قتل ہونے والوں کو شہید کہا گیا ہو۔ راہِ خدا میں مارے جانے والوں کے لئے یہ اصطلاح دراصل روایات اور اقوالِ علماء میں ملتی ہے۔ ائمہؑ اور علماء نے انہیں کیوں شہید کہا، اس کی کئی وجوہ ہیں۔ مثلاً۔

☆ راہِ خدا میں جاں نثار کرنے والے اپنی موت سے پہلے ہی اپنے اُخروی درجات و مقامات کا مشاہدہ کرلیتے ہیں۔ لہٰذا ان کے حصول کے اشتیاق میں قتل ہونے پر جان و دل سے تیار ہوتے ہیں۔

☆ راہِ خدا میں جاں نثار کرنے والوں کے حق میں خود خدا (شہادت) گواہی دیتا

ہے۔

☆ ان کے حق میں انبیاءؑ اور فرشتے (شہادت) گواہی دیتے ہیں۔

☆ یہ مجاہدین جس مقصد کے لئے اپنی جان دیتے ہیں، ان کا یہ عمل خود اس مقصد کی حقانیت اور فضیلت کا گواہ ہوتا ہے۔ مثلاً حجر ابنِ عدیؓ، میثم تمارؒ اور عمارِ یاسرؓ حضرت علیؑ کا دفاع کرتے ہوئے قتل ہوئے، ان کا یوں اپنی جانوں کو فدا کرنا ان کی طرف سے امیرالمومنین حضرت علیؑ کی حقانیت کی گواہی ہے۔

امام حسینؑ کا شہید ہونا، آپؑ کی طرف سے دینِ اسلام کی حقانیت کی گواہی ہے، آپؑ کے انصار و اعوان کا آپؑ کی رکاب میں جامِ شہادت نوش کرنا ان کی طرف سے آپؑ کی حقانیت کی گواہی ہے۔

❁

سوال نمبر۸۱ : قرآنِ کریم تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے، خواہ وہ اس کی صدا پر لبیک کہیں یا نہ کہیں، خواہ وہ اس کی دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں۔ لیکن ایک آیتِ قرآن کہتی ہے کہ "اے پیغمبر آپ ان کفار کو دعوت دیں یا نہ دیں یہ ایمان لانے والے نہیں۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۶)

بتایئے کیا اس صورت میں ایسے لوگوں کو اسلام کی دعوت نہ دی جائے جن کے بارے میں یقین ہو کہ وہ اسے قبول نہ کریں گے؟

جواب : کسی شخص کے متعلق یہ جاننا کہ یہ کسی صورت ایمان نہ لائے گا، اسے دین کی دعوت دینے میں مانع نہیں۔ کیونکہ ہمارا یہ علم کسبی ہے، ہمیں آثار و قرائن کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ فلاں شخص ایمان نہ لائے گا۔ لیکن اگر ہمارا یہ علم موہوبی ہو تب بھی ایسے شخص کو دعوت دینے میں مانع نہیں۔ کیونکہ اگر

اس یقین کی بناء پر اسے دعوت نہ دی گئی تو وہ روزِ قیامت حجت قائم کر سکتا ہے کہ مجھے تو پیغامِ حق پہنچایا ہی نہیں گیا، کوئی مبلغ میرے پاس آیا ہی نہیں، مجھے تو دین کی دعوت دی ہی نہیں گئی۔

رہی سوال میں مذکور آیت کی بات تو اس کے ذریعے پیغمبرؐ کو بعض لوگوں کے متعلق صرف خبر دی جا رہی ہے یہ آنحضرتؐ کے لئے حکم نہیں ہے۔

❁

سوال نمبر۸۲ : انسانوں کے لئے حلال و حرام مقرر کرنا اور اپنے بندوں کے لئے بندگی کی حدود کا تعین کرنا صرف خدا کے اختیار میں ہے۔ نبی و رسول کا کام خدا کے پیغام کو محض پہنچانا ہے۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے جب کہ دوسری طرف ہمیں ایک آیتِ قرآن نظر آتی ہے جس میں خداوندِ عالم پیغمبر سے مخاطب ہے کہ "آپ نے اپنے لئے اس چیز کو کیوں حرام قرار دیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال قرار دیا ہے۔" (سورۂ تحریم ۶۶- آیت ۱)

وہ کون سی چیز ہے جسے پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا؟

جواب : آیت میں اس چیز کا تذکرہ نہیں ہے لیکن سورۂ تحریم کی شانِ نزول بتاتی ہے کہ وہ چیز "شہد" ہے۔

❁

سوال نمبر۸۳ : پیغمبرِ اسلامؐ اور تمام انبیاء کرامؑ کا مشن شرک کا خاتمہ ہے۔ جب کہ ایک آیت میں خدا پیغمبرؐ سے مخاطب ہے کہ "اگر آپ شرک اختیار کریں گے تو ہم آپ کے سارے اعمال ضائع کر دیں گے۔" (سورۂ زمر ۳۹-

آیت ۶۵)

واضح کیجئے کہ کیا پیغمبرؐ سے ارتکابِ شرک ممکن ہے؟

جواب : خداوندِ عالم ایک موقع پر پیغمبرِ اسلامؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ۔

"ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک و لتکونن من الخاسرین"

"تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جاچکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہوجائے گا اور تم خسارے میں رہوگے۔" (سورۂ زمر ۳۹- آیت ۶۵)

اس آیہ کریمہ سے بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ کیا پیغمبرؐ سے ارتکابِ شرک ممکن ہے؟ کیا پیغمبرؐ کے ارتکابِ شرک کا خطرہ تھا جو خدا نے تنبیہ کی اور ان کے تمام اعمال برباد کردینے کی تہدید کی؟

اس اعتراض کی وضاحت میں چند معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

خداوندِ عالم آیاتِ قرآنی کے ذریعے مختلف گروہوں سے خطاب کرتا ہے۔ کبھی اس کے مخاطب پیغمبر ہوتے ہیں، جیسے "یاایھاالنبی، یا ایھا الرسول" جب اس طرح خطاب کیا جائے تو یا تو بات صرف پیغمبر سے کہی جارہی ہے اور ان ہی سے متعلق ہے یا پھر پیغمبر کے توسط سے امت تک بات پہنچانا مقصود ہے۔

کبھی خداوندِ عالم پیغمبر کے توسط سے براہِ راست امت کو مخاطب کرتا ہے۔

مثال کے طور پر "یا ایھاالناس، یاایھاالذین امنوا" اس طرح خطاب میں نہ محض پیغمبر مراد ہیں، نہ صرف اہلِ ایمان۔ بلکہ پوری امت کو مخاطب کیا گیا ہے۔

کبھی خداوندِ عالم صرف کفار و منافقین کو مخاطب کرتا ہے۔ مثلاً "یاایھا لکافرون، یاایھاالمنافق"

ہماری موردِ بحث آیت میں بھی دو احتمال ہیں ایک تصور یہ ہے کہ خدا کا خطاب پیغمبر سے ہے لیکن مراد امت ہے۔ جیساکہ اردو میں مثل ہے "کہنا بیٹی کو، سنانا بہو کو۔" یعنی پیغمبر کے توسط سے افرادِ امت کو پیغام دیا جارہا ہے کہ اگر انہوں نے شرک اختیار کیا تو ان کے تمام اعمال برباد کردیئے جائیں گے۔

دوسرا امکان یہ ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ پیغمبرؐ جیسی ارفع اور اعلیٰ ہستی کو مثال بنا کر لوگوں کے سامنے اس مسئلہ کی شدّت اور اہمیت کو واضح کرنا چاہتا ہے۔

ایک اور امکان یہ ہے کہ اس خطاب میں پیغمبر بھی شامل ہیں۔ یہ بات ہمارے اس عقیدے سے جو مختلف دلائل کی رو سے ہم پر ثابت ہے کہ پیغمبر معصوم عن الخطا ہوتا ہے متصادم ہے، اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں، ایک صورت میں اسے تسلیم کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ تصور ہے کہ پیغمبر بھی پورے کے پورے قرآن کے تربیت یافتہ ہیں اور ان کے عقائد کی تعمیر قرآنی آیات کے نزول ہی کے ساتھ رفتہ رفتہ ہوئی ہے۔ لیکن اگر تصور یہ ہو کہ نہیں، پیغمبر نزولِ قرآن سے پہلے ہی تربیت یافتہ تھے، ان کے عقائد نزولِ قرآن سے قبل ہی ان میں راسخ تھے تو پھر پیغمبرؐ اس خطاب میں شامل نہیں سمجھے جائیں گے۔

سوال نمبر۸۴ : عام خیال ہے کہ وحی صرف انبیاءؑ پر نازل ہوتی ہے لیکن قرآنِ کریم انبیاء کے علاوہ دوسروں پر بھی نزولِ وحی کا تذکرہ کرتا ہے۔ آیاتِ قرآنی نبی کے علاوہ کن مخلوقات پر وحی کا تذکرہ کرتی ہیں؟ آیات کے حوالے کے ساتھ بتایئے؟

جواب : لغوی طور پر خفی اور سریع پیغام رسانی کو وحی کہتے ہیں۔ یہ پیغام رسانی محض کسی آواز کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے، کلمات کی صورت میں بھی، تحریری صورت میں بھی اور کبھی دل کو کسی بات پر متوجہ کر کے بھی یہ پیغام پہنچایا جا سکتا ہے۔

قرآنِ کریم انبیاءؑ کے علاوہ جن ہستیوں اور چیزوں پر نزولِ وحی کا ذکر کرتا ہے ان کے نام قرآنی آیات کے حوالوں کے ساتھ درجِ ذیل ہیں۔

(۱) شہد کی مکھی کو وحی کرنا۔ (سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۶۸)

(۲) آسمان کو وحی کرنا۔ (سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۱۲)

(۳) زمین کو وحی کرنا۔ (سورۂ زلزال ۹۹۔ آیت ۵)

(۴) حضرت مریمؑ پر وحی کرنا۔ (سورۂ مریم ۱۹۔ آیات ۱۸ تا ۲۶ اور سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۴۲ اور ۴۵)

(۵) مادرِ موسیٰؑ کو وحی کرنا۔ (سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۳۸ اور سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۷)

(۶) حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کو وحی کرنا۔ (سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۱۱۱)

سوال نمبر۸۵ : بعض کا خیال ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، خداوندِ عالم نے

ان لوگوں کے اس نظریے کو کس طرح اور کس آیت میں مسترد کیا ہے؟

جواب : کفار فرشتوں کو خدا کی مخلوق کی بجائے اس کی بیٹیاں کہتے تھے۔ ان کے اس خیال کو کئی آیاتِ قرآن میں مسترد کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند آیات پیشِ خدمت ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

"اور ان لوگوں نے ان فرشتوں کو جو رحمان کے بندے ہیں لڑکی قرار دیا ہے، کیا یہ ان کی خلقت کے گواہ ہیں۔" (سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۱۹)

ایک اور مقام پر خداوندِ عالم فرماتا ہے۔

"پھر اے پیغمبر ان کفار سے پوچھئے کہ کیا تمہارے پروردگار کے پاس لڑکیاں ہیں اور تمہارے پاس لڑکے ہیں۔ یا ہم نے فرشتوں کو اپنی لڑکیوں کی شکل میں پیدا کیا ہے اور یہ اس کے گواہ ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ یہ اپنی من گھڑت کے طور پر یہ باتیں بناتے ہیں۔"

(سورۂ صافات ۳۷۔ آیات ۱۴۹ تا ۱۵۱)

ان آیات سے مندرجہ ذیل نکات کا استفادہ ہوتا ہے۔

☆ کیا کفار نے فرشتوں کی تخلیق کے عمل کا مشاہدہ کیا ہے جس کی بنیاد پر وہ ان کا لڑکی ہونا قرار دیتے ہیں۔

☆ وہ خود تو اپنے لئے لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے اور ان کی پیدائش پر ان کے چہرے سیاہ ہو جاتے ہیں، کس طرح خدا کی طرف جسے وہ اپنا خالق و مالک سمجھتے ہیں لڑکیوں کو منسوب کرتے ہیں۔

☆ ان کا دعویٰ من گھڑت اور بغیر کسی دلیل کے ہے۔

علاوہ ازایں سورۂ اخلاص میں "لم یلد ولم یولد" کے ذریعے صراحت

کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ نہ خدا کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ خود کسی کی اولاد ہے۔

❁

سوال نمبر۸۶ : مفسرین لکھتے ہیں کہ "سورۂ والضحیٰ" پیغمبرِ اسلامؐ پر نزولِ وحی کے بند ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوا۔ سورے کی آیات بھی اس جانب اشارہ کرتی ہیں۔ آیات کے حوالے کے ساتھ بتایئے کہ۔

(الف) کیا وحی کا بند ہو جانا پیغمبرؐ سے خدا کی ناراضگی کی وجہ سے تھا۔

(ب) یا یہ بات یہ ثابت کرتی ہے کہ پیغمبرؐ پر وحی نازل ہوتی تھی۔

جواب : اس سورے کی شانِ نزول کے بارے میں مفسرین لکھتے ہیں کہ جب پیغمبرِ اسلامؐ سے قیامت کے، ایامِ مرساہا کے اور ذوالقرنین کے حوالے سے متعدد سوال دریافت کئے گئے تو پیغمبرؐ نے فرمایا کہ ان سوالوں کے جواب کل دوں گا۔ لیکن پیغمبر پر سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا اور آپؐ ان سوالات کے جواب نہ دے سکے۔ کتنے عرصے وحی کا یہ سلسلہ منقطع رہا؟ اس بارے میں مفسرین میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ شانِ نزول کے قصے کی تائید خود اس سورے سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں روزِ روشن اور شبِ تاریک کی قسم کھائی گئی ہے اور یقیناً نزولِ وحی پیغمبرؐ کے لئے روشن دن کی مانند ہے اور اس کا منقطع ہونا شبِ تار کی مانند۔ لیکن جس طرح رات بھی انسانوں کے لئے سکون و انبساط، راحت و استراحت کے لئے ہے (جیسا کہ سورۂ نباء۷۸۔ آیت ۸ اور ۹ اسی پر گواہ ہے) اور یہ چیز انسانوں کے لئے رات کو بھی پسندیدہ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح وحی کا سلسلہ منقطع ہونا بھی پیغمبرؐ کی نبوت کے لئے اسرار و حکمتوں کا حامل ہے۔

سورۂ والضحیٰ کی دوسری آیت سے ظاہر ہے کہ وحی کا موقوف ہونا خدا کی پیغمبر

سے ناراضگی کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس کے ذریعے پیغمبرؐ اور امت کی آزمائش مقصود تھی۔ کیونکہ خداوندِ عالم اسی سورے کی اگلی آیت میں پیغمبر سے عدم ناراضگی کا ذکر کرتا ہے۔ فرماتا ہے "تمہارے پروردگار نے نہ تم کو چھوڑا ہے اور نہ تم سے ناراض ہوا ہے۔" (سورۂ والضحیٰ ۹۳۔ آیت ۳)

وحی کے منقطع ہونے کا سبب پیغمبرؐ سے خدا کی ناراضگی نہ تھا، اس کی ایک اور دلیل اسی سورے کی آیت نمبر۵ میں خدا کا یہ ارشاد ہے کہ "اور عنقریب تمہارا پروردگار تمہیں اس قدر عطا کردے گا کہ خوش ہو جاؤ۔" اس آیت میں خدا کی پیغمبر سے رضایت کا اظہار ہوتا ہے ناراضگی کا نہیں کیونکہ ظاہر ہے ناراضگی پر سزا دی جاتی ہے انعام نہیں۔ اور پھر اگلی آیات میں بھی خدا اپنے گزشتہ احسانات کا ذکر کر کے انہیں آئندہ بھی جاری رکھنے کا اشارہ دیتا ہے۔ اور یہ بات بھی خدا کی ناراضگی کی خبر نہیں دیتی۔

❁

سوال نمبر۸۷ : قرآنِ کریم میں زمین پر فساد پھیلانے والوں کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ آیات کے حوالے سے بتایئے کہ۔

(الف) مفسدین کسے کہتے ہیں؟

(ب) ان کی کیا نشانیاں بتائی گئی ہیں؟

جواب : (الف) فساد پھیلانے والے کو مفسد کہتے ہیں اور فساد کے معنی کسی چیز کے حدِ اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں۔ خواہ یہ تجاوز کم ہو یا زیادہ۔ فساد کی ضد صلاح ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ جو حدِ اعتدال سے نکل جائیں اور معاشرے میں اسی کو رواج دیں انہیں مفسد کہا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر مفسدین کی مذمت کی گئی ہے اور انہیں بُرے انجام کی خبر دی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

"جو خدا کے ساتھ مضبوط عہد کرنے کے بعد بھی اسے توڑ دیتے ہیں اور جسے خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹ دیتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقتاً خسارے والے ہیں۔"

(سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۷)

تقریباً یہی مضمون سورۂ رعد کی آیت نمبر ۲۵ اور سورۂ نحل کی آیت نمبر ۸۸ میں بھی آیا ہے۔

(ب) کون لوگ مفسد ہوتے ہیں اس بارے میں بھی قرآنِ کریم میں متعدد کا ذکر ہوا ہے۔

(۱) منافق مفسد ہیں۔ (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۱۱)

(۲) قطع رحم کرنے والے مفسد ہیں۔ (سورۂ محمد ۴۷- آیت ۲۲)

(۳) سرقہ اور چوری کرنے والے مفسد ہیں۔ (سورۂ یوسف ۱۲- آیت ۷۳)

(۴) قتل و خون ریزی کرنے والے مفسد ہیں۔ (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۳۰)

(۵) جاہ و مقام کے طالب مفسد ہیں۔ (سورۂ قصص ۲۸- آیت ۸۳)

(۶) ناپ تول میں دھاندلی کرنے والے مفسد ہیں۔ (سورۂ شعرا ۲۶- آیت ۱۸۲ اور ۱۸۳)

❁

سوال نمبر ۸۸ : بتایئے قرآنِ کریم مفسدین کے لئے کس سزا کا ذکر کرتا ہے؟

جواب : قرآنِ کریم مفسد کے لئے تین سزاؤں کا ذکر کرتا ہے۔

(۱) ہاتھ پیر کاٹنا (۲) سولی پر چڑھانا (۳) ملک بدر کرنا۔

ارشادِ الٰہی ہے۔

"بس خدا اور رسول سے جنگ کرنے والے اور زمین میں فساد کرنے والوں کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پیر مختلف سمتوں سے قطع کر دیئے جائیں یا انہیں ارضِ وطن سے نکال باہر کیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔" (سورۂ مائدہ ۵- آیت ۳۳)

❁

سوال نمبر ۸۹ : قرآنِ کریم ہر گوشۂ حیات کے بارے میں رہنمائی و ہدایت فراہم کرتا ہے۔ بتایئے مومنین کے جائے سکونت (تعمیرِ مکان) کے بارے میں کیا ہدایت پائی جاتی ہے؟ آیت کا حوالہ بھی دیجئے۔

جواب : قرآنِ کریم جائے سکونت کے بارے میں ہدایت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

"اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لئے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ قرار دو اور نماز قائم کرو اور مومنین کو بشارت دو۔" (سورۂ یونس ۱۰- آیت ۸۷)

❁

سوال نمبر ۹۰ : کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کتابِ ہدایت ہے قصصِ تاریخ کا مجموعہ نہیں۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں کثیر تعداد میں قصے

بیان ہوئے ہیں۔ ان قصوں کے بیان کا فلسفہ کیا ہے؟

جواب : قرآنِ کریم کتابِ ہدایت ہے' خود اس کی آیات اس کی اس خصوصیت کو بیان کرتی ہیں۔ اس کتاب میں جو قصص بیان ہوئے ہیں ان کا فلسفہ درجِ ذیل ہے۔

(۱) پیغمبر کے حاملِ وحی ہونے کے ثبوت کے طور پر گزشتہ انبیاء کے قصص بیان کئے گئے ہیں۔ خاص طور پر وہ واقعات و حوادث جو تاریخ میں رقم نہیں ہوئے ہیں یا اگر ضبطِ تحریر میں آئے ہیں تو پیغمبرؐ کی دسترس میں نہ تھے۔ ظاہر ہے پیغمبرؐ کو ایسے قصوں کی اطلاع وحی کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ خود قرآن پیغمبرؐ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ۔

"پیغمبر یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی وحی ہم آپ کی طرف کر رہے ہیں اور آپ تو ان کے پاس نہیں تھے۔" (سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۴۴)

نیز یہی مضمون سورۂ ہود۔ آیت ۴۹' سورۂ یوسف۔ آیت ۳ اور سورۂ قصص۔ آیت ۴۴ میں آیا ہے۔

(۲) تاریخ نے گزشتہ امتوں کے جو واقعات و حوادث توڑ مروڑ کر پیش کئے ہیں ان کی تصحیح کرنا اور انہیں حقیقی انداز میں پیش کرنا۔

(۳) تمام انبیاءؑ کے قصے بیان کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ سب ایک ہی دین و عقیدے کے ساتھ مبعوث کئے گئے ہیں۔

(۴) تمام انبیاءؑ کو نصرتِ الٰہی کی خبر دینا۔

(۵) خدا نے اپنے انبیاءؑ کو جن نعمتوں سے نوازا ہے ان کا ذکر کرنا۔

(۶) انبیاءؑ کے خلاف شیاطین کی مزاحمت کا ذکر کرنا۔

سوال نمبر۹۱ : قرآنِ کریم کی آیات بتاتی ہیں کہ صرف خدا ہی خالقِ کائنات ہے' اس کے سوا کوئی خالق نہیں۔ جب کہ قرآن میں یہ بھی موجود ہے کہ خدا "احسن الخالقین" یعنی سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے۔ اس سے ظاہراً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کے علاوہ اور بھی خالق پائے جاتے ہیں؟ واضح کیجئے۔

جواب : قرآنِ کریم اور لغاتِ عرب میں لفظ خلق (خ+ل+ق) متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے جس کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

(۱) ایجادِ مادہ : اسے ابداء کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کے مادے اور شکل و صورت کو بیک وقت خلق کرنا۔

(۲) اختراع : یعنی موجود مادے سے کوئی ایسی جدید شے تیار کرنا جو پہلے موجود نہ تھی۔ جیسے خدا فرماتا ہے۔ "انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج" "یقیناً ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے پیدا کیا ہے۔" (سورۂ دہر ۷۶۔ آیت ۲) یا جیسے دھات سے مشینیں وغیرہ بنانا۔

(۳) اختلاق : یعنی کسی چیز کو فرضی طور پر ذہن میں گھڑنا۔

اب ہم سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی خالق نہیں تو اس سے ابداء مراد ہوتی ہے۔

خلق کے دوسرے معنی "اختراع" کی چند صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خدا خلق کرتا ہے اور اس جیسا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ دوسری یہ کہ خدا کی اجازت سے کوئی اور خلق کرتا ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ کا پرندوں کو دوبارہ حیات دینا اور

حضرت عیسیٰؑ کا مردوں کو جلانا۔ تیسرے یہ کہ عام انسان کسی چیز کو خلق کرتا ہے۔

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی خالق نہیں تو اس سے مراد "ابداء" ہوتی ہے، یعنی ابداء کرنے والا صرف اور صرف خدا ہے۔ وہی ہے جس نے مادے اور اس کی شکل کو بیک وقت خلق کیا۔ اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا "احسن الخالقین" ہے یعنی سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے۔ تو اس سے مراد خلق کے دوسرے معنی یعنی اختراع ہوتے ہیں۔ یعنی خدا سب سے بہتر شکل و صورت میں پیدا کرنے والا ہے۔

❁

سوال نمبر۹۲ : قرآنِ کریم میں انسان کے خلاف سرگرمِ عمل چار محاذوں کا ذکر ہوا ہے۔ آیتِ قرآن پیش کرکے ان چاروں محاذوں کے نام بتایئے اور ان کی طاقت کیا ہے اسے بھی واضح کیجئے؟

جواب : سورۂ مبارکہ اعراف کی آیت نمبر۱۷ میں شیطان خدا سے کہہ رہا ہے کہ میں تیرے بندوں پر چار محاذوں سے حملہ کروں گا۔ یہ چار محاذ یہ ہیں۔

(۱) مقدم (۲) خلف (۳) یمین (۴) شمال۔

مقدم سے مراد دنیا اور مالِ دنیا ہے، خلف سے مراد اولاد ہے، یمین سے مراد انسان کا خود اپنے اعمال میں خود پسندی اور تکبر کا شکار ہونا ہے اور شمال سے مراد باطل قوتیں، دین میں تخریب کے لئے کی جانے والی تبلیغات اور لہو و لعب وغیرہ ہیں۔

❁

سوال نمبر۹۳ : آیاتِ قرآنی اور احادیثِ معصومینؑ کہتی ہیں کہ قرآن کی آیات

ایک دوسرے کی وضاحت کرتی ہیں؟ ایسی پانچ مثالیں پیش کیجئے جن میں آیات نے ایک دوسرے کی وضاحت کی ہو؟

جواب : خداوندِ عالم سورۂ نساء۔ آیت ۱۷۴، سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۵، سورۂ اعراف۔ آیت ۱۵۷ میں قرآنِ کریم کو "نور" کی صفت سے متصف کرتا ہے۔ نور کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود بھی روشن و واضح ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو بھی اپنی روشنی سے واضح کرتا ہے۔ چنانچہ آیاتِ قرآنی خود بھی ایک دوسرے کو واضح کرتی ہیں۔ اس سلسلے کی پانچ مثالیں درجِ ذیل ہیں۔

(۱) سورۂ انبیاء کی آیت ۸۹ میں ہے کہ۔

"اور زکریا کو یاد کرو کہ جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ دینا کہ تو تمام وارثوں سے بہتر وارث ہے۔"

اس آیت میں حضرت زکریاؑ کی پکار کے بارے میں یہ واضح نہیں کہ انہوں نے با آواز بلند پکارا تھا یا ہلکی آواز میں صدا دی تھی۔

سورۂ مریم کی آیت نمبر۲ اور ۳ اس بات کی وضاحت کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ انہوں نے ہلکی آواز میں صدا دی تھی۔ ارشادِ قدرت ہے۔

"یہ زکریا کے ساتھ تمہارے پروردگار کی مہربانی کا ذکر ہے جب انہوں نے اپنے پروردگار کو دھیمی آواز سے پکارا۔"

(۲) سورۂ فجر کی آیت ۲۲ میں ہے کہ۔

"اور تمہارا رب جلوہ فرما ہوگا اس حال میں کہ فرشتے صف در صف کھڑے ہوں گے۔"

یہاں خدا کے جلوہ افروز ہونے والی بات سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا

جسمانیت رکھتا ہے، جب کہ ایسا نہیں۔ اس بات کی وضاحت سورۂ ہود کی آیت ۷۶ ان الفاظ میں کرتی ہے۔

"اب حکمِ خدا آچکا ہے اور ان لوگوں تک وہ عذاب آنے والا ہے جو پلٹایا نہیں جاسکتا۔"

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ خدا جلوہ افروز نہ ہوگا بلکہ اس کا حکم آئے گا۔ اسی لئے بعض اس آیت (سورۂ فجر ۸۹۔ آیت ۲۲) کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ۔

"اور تمہارے پروردگار کا حکم اور فرشتے صف در صف آجائیں گے۔"

(۳) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ میں ارشاد ہے کہ۔

"ہم نے موسیٰ کو نو (۹) آیاتِ بینات (کھلی نشانیاں) دی تھیں۔"

اس آیت میں ان آیات یا معجزات کی تفصیل مذکور نہیں۔ دوسری آیات وضاحت سے بتاتی ہیں کہ یہ نو معجزات عصاء، یدِ بیضاء، دریا میں شگاف ڈالنا، پتھر سے پانی جاری کرنا وغیرہ ہیں۔

(۴) سورۂ فاتحہ کی آیت ۴ میں خداوندِ عالم کو "مالک یوم الدین" کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

"(خدا) روزِ جزا کا مالک و مختار ہے۔"

دوسرے مقام پر "مالک یوم الدین" کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ۔

"پھر تمہیں کیا معلوم کہ "یوم الدین" (روزِ جزا) کیسا ہوتا ہے۔ اس دن کوئی کسی کے بارے میں کوئی اختیار نہ رکھتا ہوگا اور سارا اختیار خدا کے ہاتھ میں ہوگا۔" (سورۂ انفطار ۸۲۔ آیت ۱۸-۱۹)

(۵) سورۂ دخان کی آیت ۳ میں ہے کہ قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا گیا ہے۔

"ہم نے قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا ہے۔"

لیکن کون سی مبارک رات میں نازل کیا ہے اس کی وضاحت سورۂ قدر کی پہلی آیت میں ان الفاظ میں ہوتی ہے۔

"بے شک ہم نے اسے شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔"

❁

سوال نمبر ۹۴ : قرآنِ کریم کی ایک آیت میں ہے کہ خدا کی تخلیق میں کوئی فرق نہ دیکھوگے۔ جب کہ دیگر متعدد آیات میں کائنات میں پائے جانے والے اختلافات کو خدا کی نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں میں کیا فرق ہے؟ وضاحت کیجئے۔

جواب : ارشادِ الٰہی ہے۔

"ماترٰی فی خلق الرحمٰن من تفاوت"

"اور تم رحمان کی خلقت میں کسی طرح کا اختلاف نہ دیکھوگے۔"

(سورۂ ملک ۶۷۔ آیت ۳)

اس آیت میں خدا کی تخلیق میں "تفاوت" کی نفی کی گئی ہے۔ اردو میں "تفاوت" کے معنی "فرق" کئے جاتے ہیں اگر آیت میں بھی یہی مراد ہے تو آیات بظاہر متضاد نظر آتی ہیں لیکن اگر عربی لغات میں تفاوت کے معنی دیکھے جائیں تو وہ ٹکراؤ اور اختلاف کے ہیں۔ اور آیت کا مفہوم یہ نکلے گا کہ خدا کی تخلیق میں کوئی چیز ایک دوسرے سے متصادم و مزاحم نہیں بلکہ سب ہم آہنگ

ہیں۔ اور اس رو سے سوال میں اٹھایا جانے والا اعتراض درست نہیں اور آیاتِ قرآنی ایک دوسرے کی تردید کرتی نظر نہیں آتیں۔

❁

سوال نمبر۹۵ : وجودِ خدا اتنا واضح و روشن ہے کہ قرآنِ کریم کی ایک آیت میں ان لوگوں پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے جو خدا کے وجود کے بارے میں شک کرتے ہیں۔ جب کہ ہم اپنے ارد گرد بہت سے ایسے لوگ پاتے ہیں جو خدا کے وجود کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ وضاحت کیجئے۔

جواب : ارشادِ الٰہی ہے۔

"قالت رسلهم افی الله شک فاطر السماوات والارض"

"تو رسولوں نے کہا کہ کیا تمہیں اللہ کے بارے میں بھی شک ہے جو زمین اور آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔" (سورۂ ابراہیم ۱۴- آیت ۱۰)

مذکورہ آیت قرآن میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ وجودِ خدا کے بارے میں شک کرنے والا کوئی نہیں۔ بلکہ کہتی ہے کہ وجودِ خدا کے بارے میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔ اور پھر اسی آیت میں اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر زمین و آسمان کی خلقت کو پیش کیا گیا ہے۔ گویا بین السطور میں استفسار کیا گیا ہے کہ اگر تمہیں خدا کے وجود کے بارے میں شک ہے تو بتاؤ کہ اس زمین اور آسمان کا خالق کون ہے۔

❁

سوال نمبر۹۶ : قرآنِ کریم کی ایک آیت کہتی ہے کہ "اس کتاب میں کوئی شک

نہیں۔" جب کہ بہت سے لوگوں کو قرآن کے بارے میں شک ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ وضاحت کیجئے۔

جواب : ارشادِ رب العزت ہے۔

"ذالک الکتاب لا ریب فیه هدی للمتقین"

"یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ صاحبانِ تقویٰ کے لئے مجسم ہدایت ہے۔"

(سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲)

یہاں بھی گزشتہ سوال کی مانند آیت میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ کوئی قرآن میں شک نہیں کرتا بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کے وحی اور کلامِ الٰہی ہونے کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ بعض دوسری آیات میں چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر اسے خدا کا کلام نہیں مانتے ہو تو ذرا اس جیسی ایک سورت یا ایک آیت ہی لے آؤ۔

❁

سوال نمبر۹۷ : قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے کہ نجم و شجر خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ جب کہ قواعدِ ادب کی رو سے ہمیشہ دو چیزوں کا ایک ساتھ ذکر اس وقت کیا جاتا ہے جب ان میں کوئی مناسبت پائی جائے۔ مثلاً ابتداء انتہا، چھوٹا بڑا وغیرہ۔ جب کہ نجم و شجر میں کوئی تناسب نہیں پھر ان کا ایک ساتھ ذکر کیوں ہوا ہے؟

جواب : قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں آیا ہے کہ کائنات کی ہر شے خداوندِ عالم کے حضور سجدہ ریز ہوتی ہے۔ اسی ضمن میں سورۂ رحمٰن میں ارشادِ الٰہی ہے۔

"والنجم والشجر یسجدان"

"اور نجم و شجر سب اسی کو سجدہ کر رہے ہیں۔"

(سورۂ رحمٰن ۵۵۔ آیت ۶)

قواعدِ ادب کی رو سے دو چیزوں کا ایک ساتھ ذکر اس صورت میں کیا جاتا ہے جب ان کے درمیان کوئی مناسبت پائی جائے۔ سوال یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں "نجم و شجر" میں کیا مناسبت پائی جاتی ہے جو اس کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ اس آیت میں "نجم و شجر" کے ایک ساتھ ذکر کے بارے میں دو توجیہات ممکن ہیں۔

پہلی توجیہ تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی بعض آیات میں زمین و آسمان کا بھی ایک ساتھ ذکر ہوا ہے، بعض میں زمین و آسمان کے سجدے کا ذکر ہوا ہے اور بعض آیات کہتی ہیں کہ جو کچھ زمین میں اور جو کچھ آسمان میں ہے سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ ممکن ہے مذکورہ آیت میں نجم و شجر کے الفاظ سے یہی بتانا مقصود ہو کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے سب ربِ کائنات کو سجدہ کرتے ہیں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ نجم سے مراد بغیر تنے کے نباتات ہوتے ہیں جیسے بیل اور بوٹیاں وغیرہ۔ اور آیت میں شجر کے ساتھ ان کے سجدے کا ذکر ہے اور ان میں مناسبت بھی پائی جاتی ہے۔

اکثر مفسرین ان میں سے دوسری توجیہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان توجیہات کی رو سے آیت میں "نجم و شجر" کے ایک ساتھ ذکر پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

سوال نمبر۹۸ : قرآنِ کریم کی بعض سوروں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے۔ بتایئے کیا حروفِ مقطعات۔

(الف) بے معنی حروف ہیں۔

(ب) حروف کی ابجد کے لحاظ سے کوئی عدد مراد ہے۔ یعنی تعداد بتانی چاہی ہے۔

(ج) ان حروف کے ذریعے سامعین کو متوجہ کرنا مقصود ہے۔

(د) عربوں کی فصاحت و بلاغت کو چیلنج کرنا مطلوب ہے۔

(ہ) قرآن کا خلاصہ ہیں جو شبِ قدر میں پیغمبر پر نازل ہوا۔

(و) حبیب و محبوب کے درمیان راز و نیاز ہے۔

جواب : بالترتیب تمام سوالوں کے جواب یوں ہوں گے۔

(الف) یہ کہنا درست نہیں کہ حروفِ مقطعات بے معنی حروف ہیں۔ کیونکہ یہ سمجھنا قرآن میں (معاذاللہ) مہمل باتوں کے شامل ہونے کا عقیدہ رکھنا ہوگا۔

(ب) ان حروف کو علم الاعداد کے نکتہ نظر سے دیکھنا بھی درست نہیں۔ علم الاعداد کا جو تصور اس وقت پایا جاتا ہے اور لوگ اعداد کے ذریعہ جو تعویذ وغیرہ لکھتے ہیں دراصل اس کی کوئی منطق نہیں۔ حروفِ مقطعات کو علم الاعداد کے نکتہ نظر سے دیکھنے والوں نے ان کے ذریعہ قیامت کے دن و تاریخ کا بھی تعین کیا ہے جب کہ خود قرآنِ کریم قیامت کے دن و تاریخ کو اسرارِ الٰہی میں سے ایک بتاتا ہے، علم الاعداد کے اس غلط تصور کو مسترد کرتے ہوئے شہید مطہری "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ ۷۸۶ لکھنے کو بھی خرافات میں سے قرار دیتے ہیں۔

(ج) یہ بات اس لئے قابلِ قبول نہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو اسے ایسی جگہوں پر تو معقول سمجھا جا سکتا تھا جہاں محض ایک کلمہ یا ایک آیت بیان کرنی ہو، جب کہ

حروفِ مقطعات تو چھوٹی سوروں کی ابتداء میں بھی نہیں بلکہ بڑے اور طویل سوروں کی ابتداء میں آئے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر حروفِ مقطعات لوگوں کو متوجہ کرنے کی غرض سے ہیں تو انہیں ایسے سوروں کی ابتداء میں ہونا چاہئے تھا جو ابتدائے اسلام میں مکہ میں نازل ہوئے نہ کہ بعد کے دور میں مدینہ میں نازل ہونے والے سوروں میں۔

(د) کہا جاتا ہے کہ اس طریقے سے عربوں کی فصاحت و بلاغت کو چیلنج کیا گیا ہے اور انہیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ پیغمبرؐ جو قرآنی آیات تلاوت کرتے ہیں وہ انہیں حروف سے مرکب ہیں جنہیں تم روزمرہ گفتگو میں استعمال کرتے ہو اور اگر یہ کلامِ بشر ہے تو تم بھی بشر ہو انہی حروف کے ذریعے ان جیسی آیات بنا لاؤ۔ یہ مفروضہ درست محسوس ہوتا ہے لیکن اس میں سقم یہ نظر آتا ہے کہ کیا اس دور کے لوگ خود آیات کو سننے کے بعد یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے الفاظ تو انہی حروف کا مجموعہ ہیں جنہیں ہم روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں؟ کیا ضرورت تھی کہ انہیں الفاظ کو علیحدہ علیحدہ جتا کر بتایا جائے؟

(ح) حروفِ مقطعات کو شبِ قدر میں پیغمبرؐ پر نازل ہونے والے ایسے محکمات بھی نہیں کہا جا سکتا جو خلاصہ کر کے نازل کئے گئے ہوں کیونکہ محکم کے معنی واضح ہیں جب کہ حروفِ مقطعات سے کوئی بات واضح نہیں۔

(و) ہاں انہیں حبیب اور محبوب کے درمیان رمزیہ الفاظ کہا جا سکتا ہے جو دوسروں کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔

❁

سوال نمبر۹۹ : قرآنِ کریم میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے

مطالبہ کیا کہ اپنے خدا کا نظارہ کرواؤ تو خدا نے آسمانی بجلی کے عذاب سے ان سب کو ختم کر ڈالا۔ لیکن جب حضرت موسیٰؑ نے خدا سے اپنا جلوہ دکھانے کی درخواست کی تو فرمایا کہ پہاڑ کی طرف دیکھو۔ خدا کے اس جواب میں فرق کی کیا وجہ ہے؟

جواب : اس میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے تمام معجزات دیکھنے اور راہِ ہدایت پر چل پڑنے کے بعد خدا کو جسمانی طور پر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ان کا یہ مطالبہ درحقیقت ارتداد کی مانند تھا' ایمان لانے کے بعد اظہارِ کفر تھا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے جو درخواست کی وہ ایک خاص معرفت کے حصول کے لئے تھی' حضرت ابراہیمؑ کی اس درخواست کی مانند تھی جو انہوں نے روزِ قیامت لوگوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی بابت مزید اطمینان کے حصول کے لئے کی تھی۔

حضرت موسیٰؑ کو سوال کرنے کا حق تو تھا لیکن جواب کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے' جب کہ بنی اسرائیل کو ایسے سوال کا حق بھی نہ تھا۔

❁

سوالات وجوابات

مقابلہ معارفِ قرآن ۱۴۱۶ھ

سوال نمبر۱ :- آیت کے کیا معنی ہیں؟

جواب : آیت علامت اور نشانی کو کہتے ہیں۔

سوال نمبر۲ :- سورہ کسے کہتے ہیں؟

جواب : لفظ سورہ یا تو "سورۃ البلد" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں وہ دیوار جو شہر کے گرد ہوتی ہے اور اسی نسبت سے سورہ ان آیات کے مجموعہ کو کہتے ہیں جو دو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے درمیان واقع ہوں۔ یا پھر یہ لفظ "سور شراب" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں شربت کا بقیہ حصہ یعنی تلچھٹ اور اس نسبت سے قرآن کے بقیہ کو سورہ کہتے ہیں۔

سوال نمبر۳ :- قرآن میں سب سے طویل آیت کون سی ہے؟

جواب : قرآن کی سب سے طویل آیت سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۲ ہے۔

سوال نمبر۴ :- قرآن میں سب سے مختصر کون سی آیت ہے؟

جواب : قرآن کی سب سے مختصر آیت سورہ رحمٰن کی ۶۴ ویں آیت ہے جو صرف "مدھامتان" ہے۔

سوال نمبر۵ :- سورہ حمد کو سبع مثانی کیوں کہتے ہیں؟

جواب : چونکہ اس سورے میں سات آیات ہیں اس لئے اس کو سبع کہتے ہیں۔ اس کو مثانی کہنے کی چند وجوہات ہیں مثلاً۔

(۱) - یہ سورہ دو مرتبہ نازل ہوا۔ ایک مرتبہ مکہ میں اور ایک مرتبہ مدینہ میں۔ اس لئے اسے مثانی کہتے ہیں۔

(۲) - نماز میں دو مرتبہ اس سورے کی تلاوت کی جاتی ہے، اس لئے بھی اسے مثانی کہتے ہیں۔

(۳) - اس سورے کا ایک حصہ خدا سے متعلق ہے اور ایک حصہ بندے سے، اس لئے بھی اسے مثانی کہتے ہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر اسے سبع مثانی کہا جاتا ہے۔

سوال نمبر۶ :- قرآن میں کل کتنی آیات ہیں؟

جواب : بصریوں کے خیال میں قرآن کی ۶۲۱۶ اور کوفیوں کے نزدیک ۶۲۳۶ آیات ہیں۔

سوال نمبر۷ :- قرآن میں کتنے سورے حروف مقطعات سے شروع ہوتے ہیں؟

جواب : قرآن کے ۲۹ سورے حروف مقطعات سے شروع ہوتے ہیں۔ ان میں سے تین سورے صرف ایک حرف سے شروع ہوتے ہیں، یعنی ص، ق، ن اور بعض سورے دو حروف مقطعات سے شروع ہوئے ہیں جیسے طہ، یس، حم۔

سوال نمبر۸ :- قرآن کے کتنے سورے "الحمد" سے شروع ہوئے ہیں؟

جواب : قرآن کے جو سورے "الحمد" سے شروع ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔ سورہ الحمد، سورہ انعام، سورہ کہف، سورہ سبا، سورہ فاطر۔

سوال نمبر۹ :- حضرت موسیٰؑ کے معجزات کیا کیا ہیں؟

جواب : سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر۱۰۱ کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو نو معجزات عطا کئے گئے تھے، جو یہ ہیں۔ عصا، ید بیضا، طوفان، ٹڈیاں، جوں اور مینڈک، من وسلویٰ، پتھر سے چشمے جاری کرنا، مردوں کو زندہ کرنا۔

سوال نمبر۱۰ :- حضرت عیسیٰؑ کے معجزات بیان کیجئے؟

جواب : سورہ آل عمران کی آیت نمبر۴۹ اور سورہ مائدہ کی آیت نمبر۱۱۰ کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کے یہ معجزت تھے۔ مردوں کو زندہ کرنا، مٹی کے پرندے بنا کر ان میں جان ڈالنا، پیدائشی اندھے اور مبروص کا علاج کرنا، لوگ گھروں میں جو کھاتے تھے اور جو جمع کرتے تھے اس کی خبر دینا، گہوارے میں باتیں کرنا۔

سوال نمبر۱۱ :- وہ کون سے پیغمبر ہیں جن کا بیٹا کافر تھا؟

جواب : حضرت نوحؑ کا بیٹا کافر تھا۔

سوال نمبر۱۲ :- قرآن میں کتنے انبیاء اور رسولوں کا ذکر آیا ہے؟

جواب : قرآن کریم میں پچیس انبیاء ورسل کا ذکر آیا ہے۔

سوال نمبر۱۳ :- قرآن میں کتنی آسمانی کتب کا ذکر آیا ہے؟ نام لکھئے۔

جواب : قرآن، تورات، انجیل، صحف ابراہیم و موسیٰؑ اور زبور کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔

سوال نمبر۱۴ :- "مغضوب علیھم" سے مراد کون ہیں؟

جواب : یہود مراد ہیں۔

سوال نمبر۱۵ :- "ولا الضالین" سے مراد کون ہیں؟

جواب : نصاریٰ مراد ہیں۔

سوال نمبر۱۶ :- "حطمه" سے کیا مراد ہے؟

جواب : "حطمه" بھڑکتی ہوئی اور نہ ٹھنڈی ہونے والی آگ کو کہتے ہیں۔

سوال نمبر۱۷ :- وہ کون سی خاتون ہیں جن کا ذکر قرآن میں (نام کے ساتھ) آیا ہے؟

جواب : حضرت مریمؑ کا ذکر قرآن کریم میں نام کے ساتھ آیا ہے۔

سوال نمبر۱۸ :- قرآن کریم میں قیامت کے کتنے نام آئے ہیں؟

جواب : قرآن میں قیامت کے بارہ نام آئے ہیں۔ قارعہ، حاقہ، ساعہ، یومِ آخر، بعث، یومِ تغابن، نباء عظیم، واقعہ، یوم الفصل، یوم الجمع، راجفہ اور قیامت۔

سوال نمبر۱۹ :- قرآن مجید کے کس سورے میں غزوۂ تبوک کا ذکر ہے؟

جواب : سورۂ توبہ۔ آیت نمبر۴۰ تا ۵۴ غزوہ تبوک کے ذکر پر مشتمل ہے۔

سوال نمبر۲۰ :- خداوندِ عالم نے قومِ لوط، قومِ ثمود اور فرعون کو کس طرح ہلاک کیا؟

جواب : خداوندِ عالم نے قومِ لوط کو زمین الٹ کر (سورہ عنکبوت۲۹۔ آیت ۳۷)، قومِ ثمود کو چنگھاڑ کے ذریعے (سورہ قمر۵۴۔ آیت ۲۳ تا ۳۱) اور فرعون کو غرق کرکے ہلاک کیا۔ (سورہ بقرہ۲۔ آیت ۵۰، سورہ انفال۸۔ آیت ۵۴، سورہ اعراف۷۔ آیت ۱۳۶)

سوال نمبر۲۱ :- وہ کون سا سورہ ہے جس کا اختتام ایک پیغمبر کے نام سے ہوا ہے؟

جواب : سورۃ الاعلیٰ کا اختتام ایک پیغمبر کے نام سے ہوا ہے۔

سوال نمبر۲۲ :- سورۂ بقرہ کو بقرہ کیوں کہتے ہیں؟

جواب : کیونکہ اس میں گائے کا قصہ بیان ہوا ہے جسے عربی میں بقرہ کہتے ہیں۔(سورہ بقرہ۲- آیات ۶۷، ۶۸، ۶۹ اور ۷۱)

سوال نمبر۲۳ :- خداوندِ عالم کی طرف سے آنے والے انبیاء میں سے ایک حضرت ادریسؑ ہیں۔ ان کا ذکر کس سورہ میں ہوا ہے؟

جواب : سورۂ مریم آیت نمبر۵۶، سورہ نساء آیت نمبر۸۵ میں حضرت ادریسؑ کا ذکر ہوا ہے۔

سوال نمبر۲۴ :- حضرت نوحؑ کے زمانے میں جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی ان کا ذکر قرآنِ مجید کے کس سورے میں ہوا ہے؟ اور ان بتوں کے کیا نام ہیں؟

جواب : سورۂ نوح آیت نمبر۲۳ میں ان کا ذکر ہوا ہے اور ان کے نام ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہیں۔

سوال نمبر۲۵ :- وہ کون سا سورہ ہے جس میں لفظ اللہ ۷۵ مرتبہ ذکر ہوا ہے؟

جواب : سورہ حج میں ۷۵ مرتبہ لفظ اللہ آیا ہے۔

سوال نمبر۲۶ :- مکہ میں نازل ہونے والا آخری سورہ کون سا ہے؟

جواب : سورۃ مطففین مکہ میں نازل ہونے والا آخری سورہ ہے۔

سوال نمبر۲۷ :- رسولِ مقبولؐ پر سب سے آخر میں نازل ہونے والا سورہ کون سا ہے؟

جواب : آنحضرتؐ پر نازل ہونے والا سب سے آخری سورہ سورۃ النصر۔ "اذا جاء نصر اللہ---" ہے۔

سوال نمبر۲۸ :- وراثت کی تقسیم کے بارے میں قرآنِ کریم میں کتنی صورتوں

کا ذکر ہے؟

جواب : وراثت کی تقسیم کے حوالے سے قرآن میں چھ صورتوں کا ذکر ہوا ہے۔ (۱) نصف، (۲) ربع، (۳) ثمن، (۴) ثلثان، (۵) ثلث اور (۶) سدس۔

سوال نمبر۲۹ :- قرآنِ کریم کی کون سی آیت کے بارے میں پیغمبرِ اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے؟

جواب : سورہ فتح کی آیت "انا فتحنا---" آنحضرتؐ کو سب سے زیادہ پسند تھی۔

سوال نمبر۳۰ :- قرآنِ کریم میں حوامیمِ سبع کون سے ہیں؟

جواب : قرآنِ کریم میں حوامیمِ سبع سورہ غافر، سورہ فصلت، سورہ شوریٰ، سورہ زخرف، سورہ دخان، سورہ جاثیہ اور سورہ احقاف ہیں۔

سوال نمبر۳۱ :- قرآنِ مجید کا وہ کون سا سورہ ہے جسے حضرت جعفر طیار نے ملکِ نجاشی کو سنایا اور جس کو سن کر ملکِ نجاشی اور اس کے درباریوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے؟

جواب : وہ سورہ سورۂ مریم ہے۔

سوال نمبر۳۲ :- رمضان کا ذکر قرآن میں کتنی مرتبہ آیا ہے؟ حوالہ دیجئے۔

جواب : صرف ایک مرتبہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر۱۸۵ میں۔

سوال نمبر۳۳ :- قرآنِ کریم میں ایک کافر شخص کی زوجہ کو مومنہ کہا گیا ہے۔ وہ شخص کون ہے اور اس بات کا ذکر کس سورے میں آیا ہے؟

جواب : وہ شخص فرعون ہے اور اس بات کا ذکر سورۂ تحریم کی آیت نمبر۱۱ میں

آیا ہے۔

سوال نمبر۳۴ :- یہ جملہ "وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا---" قرآن کریم میں دو مرتبہ آیا ہے لیکن ایک کے اختتام پر انسان کو "لظلوم کفار" کہا گیا ہے جب کہ دوسری جگہ اس جملے کا اختتام "ان اللہ لغفور رحیم" پر ہوا ہے۔ فرق کیا ہے؟

جواب : یہ جملہ پہلی مرتبہ سورۂ ابراہیم کی آیت نمبر۳۴ میں آیا ہے اور وہاں انسان اور انسان کی فطرت کا ذکر ہوا ہے کہ وہ فطرتاً نعمات کو فراموش کرنے والا ہے۔ جب کہ دوسری مرتبہ یہ جملہ سورۂ نحل کی آیت نمبر۱۸ میں آیا ہے جہاں خدا کے غفور و رحیم ہونے کا اثبات کیا گیا ہے۔

سوال نمبر۳۵ :- قرآن کے کتنے نام ہیں؟

جواب : قرآن کے نام قرآن، کتاب، ذکر، فرقان، تنزیل اور نور ہیں۔

سوال نمبر۳۶ :- قرآن میں سب سے بڑا کلمہ کون سا ہے؟

جواب : "فسیکفیکھم---" (سورہ بقرہ۲- آیت ۱۳۷) قرآن کا سب سے بڑا کلمہ ہے۔

سوال نمبر۳۷ :- قرآنِ مجید میں حدِ زنا کے بیان میں عورت کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟

جواب : زنا عورت اور مرد کی ناجائز مجامعت کا نام ہے۔ اس جنسی ملاپ میں عورت اور مرد دونوں کا کردار ہوتا ہے۔ لیکن طرفین میں سے ایک کا کردار قوی اور دوسرے کا ضعیف ہے۔

زنا کا عمل دراصل ایک تبادلہ کے نظام کے تحت انجام پاتا ہے۔ اس میں

ایک فریق کی حیثیت پیش کرنے والے کی ہوتی ہے اور دوسرے کی خریدار کی۔ پیش کرنے والا اپنے مال کی نمائش کرتا ہے تاکہ اس کے لئے خریدار میسر آسکے۔ بعض عورتیں کھلے بندوں اپنی آرائش و زیبائش کا اظہار کرکے مرد کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہیں اور یوں مرد میں شہوت کی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم عورتوں کو اپنی زیب و زینت کے اظہار سے سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔

"ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہٖ مرض و قلن قولا معروفا وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ"

"کسی آدمی سے لگی لپٹی بات نہ کرنا کہ جس کے دل میں بیماری ہو اسے لالچ پیدا ہو جائے اور ہمیشہ نیک باتیں کیا کرو اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور پہلی جاہلیت جیسا بناؤ سنگھار نہ کرو۔"

(سورۂ احزاب ۳۳- آیت ۳۲، ۳۳)

مذکورہ آیت میں خداوندِ عالم عورتوں کو مردوں سے نرم اور میٹھے لہجے میں بات چیت سے منع کرتا ہے اور زینت کے اظہار سے روکتا ہے کیونکہ اس طرح بیمار دل مردوں کے دل میں لالچ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

اگرچہ مرد میں پائی جانے والی جنسی خواہش پائیدار ہوتی ہے لیکن عورت کی یہ خواہش زیادہ شدید ہوتی ہے، اس میں زیادہ حدّت پائی جاتی ہے اور وہ جلد بھڑک اٹھتی ہے۔ نیز زنا بالجبر کے سوا مجامعت میں عورت کی رضاء و رغبت شامل ہوتی ہے، اگر عورت رضامند نہ ہو تو مجامعت واقع نہیں ہو سکتی۔

ان معروضات کی روشنی میں واضح ہے کہ ارتکاب زنا میں عورت کا کردار قوی ہوتا ہے اسی لئے اس کا ذکر پہلے آیا ہے۔

سوال نمبر۳۸ :- قبر کھودنے کی تعلیم سب سے پہلے کس سے ملی اور قرآنِ مجید میں کس جگہ اس کا ذکر ہے؟

جواب : انسان کو قبر کھودینے کی تعلیم کوّے کے ذریعے اس وقت دی گئی جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ آیتِ قرآن ہے۔

"پھر خدا نے ایک کوّا بھیجا جو اس کو دکھائے کہ بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے گا۔" (سورہ مائدہ۵- آیت۳۱)

سوال نمبر۳۹ :- قرآنِ کریم کی سورتوں میں سے ایک سورہ کا نام سورۂ مومن ہے۔ اس کو سورۂ مومن کیوں کہا گیا ہے اور اس کا دوسرا نام کیا ہے؟

جواب : اس سورے کی اٹھائیسویں آیت میں ہے "وقال رجل مومن---" اس لئے اسے سورۂ مومن کہتے ہیں۔ اس سورے کا دوسرا نام سورۂ غافر ہے۔

سوال نمبر۴۰ :- شریعتِ اسلام میں ایامِ حیض میں عورتوں سے جماع کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیا یہ سنت سے ثابت ہے یا قرآن سے۔ اگر قرآن سے ثابت ہے تو کون سی آیت سے؟

جواب : قرآنِ مجید کے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر۲۲۲ سے ایامِ حیض میں عورتوں سے جماع کا حرام ہونا ثابت ہے۔

"اور اے پیغمبر یہ لوگ تم سے ایامِ حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ حیض ایک اذیت اور تکلیف ہے لہٰذا اس زمانے میں

عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ پھر جب پاک ہو جائیں تو جس طرح سے خدا نے حکم دیا ہے اس طرح ان کے پاس جاؤ۔"

سوال نمبر۴۱ :- عربی زبان میں کسی انسان کو پکارنے کے تین طریقے ہیں جن میں صریحاً کنیت ہے۔ قرآن میں وہ کون سی آیت ہے جس میں کنیت سے پکارا گیا ہے؟

جواب : قرآنِ کریم کی ایک سو گیارہویں سورہ المسد کی پہلی آیت میں یوں پکارا گیا ہے۔ "تبت یدا ابی لھب و تب"

ابولہب کا نام عبدالعزیٰ تھا' ابولہب اس کی کنیت ہے۔

سوال نمبر۴۲ :- الٰہی نظام کو چلانے کے لئے مامور فرشتوں میں جہنم کو چلانے والے فرشتوں کے سربراہ کا کیا نام ہے؟

جواب : اس کا نام مالک ہے۔ (سورہ زخرف ۴۳- آیت۷۷)

سوال نمبر۴۳ :- سورۂ نجم کی تیسری آیت میں ہے "وما ینطق عن الھوٰی" یعنی پیغمبرؐ بغیر وحی بات نہیں کرتا۔ اگر پیغمبرؐ بغیر وحی بات نہیں کرتا تو کیا حدیث بھی وحی ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر قرآن اور حدیث میں کیا فرق ہے؟ اگر کہا جائے کہ حدیث کے الفاظ خود پیغمبرؐ کے اپنے ہوتے ہیں تو پھر وہ احادیث جن کے الفاظ بھی خدا کے الفاظ ہیں جنہیں حدیثِ قدسی کہتے ہیں ان احادیث اور قرآن میں کیا فرق ہے؟

جواب : اس سوال کا جواب چند نکات کی صورت میں ہے۔

(۱) - قرآنِ کریم کی سند قطعی ہے کہ وہ خدا سے صادر ہے جب کہ ہر حدیث

کی سند ثابت نہیں کہ وہ پیغمبرؐ کے دہانِ مبارک سے جاری ہوئی ہے یا نہیں۔

(۲) - قرآن کے الفاظ اور معنی دونوں خدا کے ہیں جب کہ حدیث کے الفاظ پیغمبرؐ کے ہیں اور معنی خدا کے ہیں۔

(۳) - قرآن کے الفاظ کی ساخت میں اعجاز اور چیلنج ہے جب کہ حدیثِ قدسی کے الفاظ کو اعجاز کہہ کر چیلنج نہیں کیا گیا۔

سوال نمبر۴۴ :- قرآنِ کریم ۲۳ سال کی مدت میں حسبِ ضرورت و تقاضا نازل ہوا' رات کو بھی نازل ہوا اور دن کو بھی۔ جب کہ اکثر و بیشتر آیات دن کو نازل ہوئیں کیونکہ ضروریات دن کو پیش آتی تھیں۔ لیکن سورۂ قدر کی آیت میں ارشادِ الٰہی ہے کہ ہم نے قرآن کو "لیلۃ القدر" (رات) میں نازل کیا۔ اس اختلاف کی حقیقت کیا ہے اور اختلاف کی کیا وجہ ہے؟

جواب : اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دراصل قرآن کے دو نزول ہیں۔

(۱) - نزولِ تدریجی اور تفصیلی : نزولِ تدریجی اور تفصیلی رات کو بھی ہوا اور دن کو بھی۔ دن میں زیادہ تر ہوا جیسا کہ سوال میں بتایا گیا ہے۔

(۲) - نزولِ دفعی : قرآن کا دوسرا نزول نزولِ دفعی ہے اور قرآن کا نچوڑ اور خلاصہ ہے جو کُل کا کُل ایک رات میں نازل ہوا۔ سورۂ قدر میں قرآن کے رات میں نزول کا ذکر اسی نزول کی جانب اشارہ ہے۔

سوال نمبر۴۵ :- قرآنِ کریم کی وہ کون سی آیت ہے جس میں روٹی کا ذکر ہے؟

جواب : قرآنِ کریم میں روٹی کا ذکر سورہ یوسف کی آیت نمبر۳۶ میں آیا ہے۔

سوال نمبر۴۶ :- ایک گناہ کے بارے میں قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر پیغمبرؐ بھی ستر بار استغفار کریں تو وہ گناہ نہیں بخشا جائے گا۔ وہ کون سا گناہ ہے اور

اس کا ذکر کس آیت میں ہے؟

جواب : وہ گناہ لوگوں کو جہاد سے روکنا ہے اور اس کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت نمبر۸۰ میں ہے۔

سوال نمبر۴۷ :- وہ کون سی آیت ہے جس میں حتمی طور پر شراب سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟

جواب : سورۂ مائدہ کی آیت نمبر۹۰ میں شراب سے اجتناب کا قطعی حکم موجود ہے۔

سوال نمبر۴۸ :- وہ کون سی معدن ہے جس کا قرآن میں چھ بار ذکر ہوا ہے؟ حوالہ بھی دیجئے۔

جواب : وہ معدن چاندی ہے۔ اس کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت نمبر۱۴' سورۂ توبہ کی آیت نمبر۳۴' سورۂ زخرف کی آیت نمبر۳۳' سورۂ دہر کی آیت نمبر۱۵' آیت نمبر۱۶ اور آیت نمبر۲۱ میں ہوا ہے۔

سوال نمبر۴۹ :- وہ کون سا گناہ ہے جس پر قرآن نے ۸۰ کوڑے لگانے کا حکم دیا ہے؟ آیت کا حوالہ بھی دیں۔

جواب : وہ گناہ جس پر قرآن نے ۸۰ کوڑے لگانے کا حکم دیا ہے کسی پر زنا کی تہمت لگانا ہے۔ اور اس کا ذکر سورۂ نور کی آیت نمبر۴ میں ہوا ہے۔

سوال نمبر۵۰ :- قرآنِ مجید کا وہ کون سا سورہ ہے جس کی تمام آیتیں حرفِ سین پر ختم ہوتی ہیں؟

جواب : سورۂ والناس کی تمام آیات سین پر ختم ہوتی ہیں۔

سوال نمبر۵۱ :- قرآنِ مجید کا وہ کون سا سورہ ہے جسے سورۃ الوداع بھی کہتے

ہیں؟

جواب : سورۃ النصر کو سورۃ الوداع بھی کہتے ہیں۔

سوال نمبر۵۲ :- قرآنِ کریم کا وہ کون سا سورہ ہے جس میں خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ اگر انسان ایمان اور تقویٰ کو اپنائے تو خدا آسمان سے رزق برسائے گا؟

جواب : ارشادِ الٰہی ہے۔

"اور اگر اہلِ قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین و آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔"

(سورۂ اعراف ۷- آیت ۹۶)

سوال نمبر۵۳ :- قرآنِ مجید کا وہ کون سا سورہ ہے جس میں خدا فرماتا ہے کہ خدا کے بندوں میں خدا سے ڈرنے والے صرف علماء ہیں؟

جواب : ارشادِ الٰہی ہے۔

"لیکن اللہ سے ڈرنے والے اس کے بندوں میں صرف صاحبانِ معرفت ہیں۔" (سورۂ فاطر ۳۵- آیت ۲۸)

سوال نمبر۵۴ :- قرآنِ مجید کا وہ کون سا سورہ ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کی گردنیں ماریں اور ان کو اسیر بنائیں؟

جواب : ارشادِ الٰہی ہے :

"پس جب کفار سے مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ جب زخموں سے چور ہو جائیں تو ان کی مشکیں باندھ دو۔"

(سورۂ محمد ۴۷- آیت ۴)

سوال نمبر۵۵ :- قرآنِ مجید میں خداوندِ عالم پیغمبرِ اکرمؐ سے فرماتا ہے کہ فلاں

صحابی اگر اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو آپؐ اس کو اپنے عقد میں لے لیں۔ وہ کون سے صحابی ہیں اور یہ ذکر کس آیت میں ہے؟

جواب : صحابی کا نام زید بن حارثہ ہے اور یہ ذکر سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۷ میں ہے۔

سوال نمبر۵۶ :- ربوٰ (سود) کی حرمت کے بارے میں قرآنِ مجید کی کس آیت میں حکم نازل ہوا ہے؟

جواب : سود کی حرمت کا حکم درجِ ذیل آیت میں نازل ہوا ہے۔

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ روزِ قیامت اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ اس لئے کہ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ تجارت بھی سود جیسی ہے جب کہ خدا نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔" (سورۂ بقرہ ۲- آیت ۲۷۵)

سوال نمبر۵۷ :- قرآنِ مجید کی وہ کون سی آیت ہے جس میں پیغمبرِ اکرمؐ سے اونچی آواز میں بات کرنے سے منع کیا گیا ہے؟

جواب : سورۂ حجرات کی آیت نمبر دو میں نبیؐ سے اونچی آواز میں گفتگو سے منع کیا گیا ہے۔

سوال نمبر۵۸ :- وہ کون سے حشرات اور پرندے ہیں جنہوں نے ایک پیغمبر سے تکلم کیا ہے؟

جواب : چیونٹی اور ہدہد نے ایک پیغمبر سے کلام کیا ہے۔

سوال نمبر۵۹ :- وہ کون سا سورہ ہے جس کی ہر آیت میں لفظ اللہ ہے؟

جواب : سورۂ مجادلہ کی ہر آیت میں لفظ اللہ آیا ہے۔

سوال نمبر۶۰ :- وہ کون سی آیت ہے جو سب سے پہلے نازل ہوئی؟

جواب : سورۃ العلق کی پہلی آیت۔ "اقرا باسم ربک الذی خلق" سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت ہے۔

سوال نمبر۶۱ :- قرآنِ مجید کے وہ کون سے دو سورے ہیں جن میں سے ایک سورے کے آخری لفظ سے دوسرے سورے کی ابتداء ہوتی ہے؟

جواب : سورۂ طور و سورۂ نجم اور سورۂ قدر و سورۂ فجر۔

سوال نمبر۶۲ :- اولوالعزم پیغمبر کون ہیں؟

جواب : حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ اولوالعزم پیغمبر ہیں۔

سوال نمبر۶۳ :- وہ کون سا سورہ ہے جس میں "بسم اللہ" دو مرتبہ آیا ہے؟

جواب : سورۂ نمل۔ اس سورے کی ابتداء اور آیت نمبر۳۰ میں بسم اللہ آیا ہے۔

سوال نمبر۶۴ :- وہ کون سا سورہ ہے جس میں دو سجدے ہیں؟

جواب : سورۂ حج میں دو سجدے ہیں۔

سوال نمبر۶۵ :- وہ کون سا سورہ ہے جو یہود اور بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوا ہے؟

جواب : سورۂ حشر یہود اور بنی نضیر کے بارے میں نازل ہوا ہے۔

سوال نمبر۶۶ :- اُمّ القریٰ کسے کہتے ہیں؟

جواب : مکہ کو ام القریٰ کہتے ہیں۔

سوال نمبر۶۷ :- حجِ اکبر کون سا دن ہے؟

جواب : حج اکبر کے متعلق مختلف آراء ملتی ہیں۔ مثلاً۔

(۱) بعض لوگوں کے خیال میں حجِ اکبر سے مراد عرفہ ہے۔

(۲) بعض لوگ کہتے ہیں کہ حجِ اکبر سے مراد تمام ایامِ حج ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کہا جاتا ہے کہ یوم الجمل، یوم الصفین حالانکہ یہ جنگیں کئی ایام پر مشتمل ہیں لیکن انہیں ایک ہی دن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۳) بعض لوگ عمرے کے مقابل حج کو حجِ اکبر کہتے ہیں کیونکہ اس میں عرفات، مشعر اور منیٰ کا وقوف ہوتا ہے جب کہ عمرے میں یہ نہیں ہوتا۔

(۴) بعض صرف ایامِ منیٰ کو حجِ اکبر قرار دیتے ہیں۔

(۵) بعض کے نزدیک حجِ اکبر سے مراد آنحضرتؐ کا حجۃ الوداع ہے۔

(۶) بعض کے نزدیک دسویں ذی الحجہ کا وہ روز حجِ اکبر تھا جس دن حضرت علیؑ نے آیتِ برات کی تلاوت فرمائی۔

(۷) بعض کے خیال میں حجِ اکبر وہ دن ہے جس میں عرفہ کے دن جمعہ پڑ جائے۔

ہمارے نزدیک ان لوگوں کا خیال درست ہے جو عمرے کے مقابل حج کو (جس میں کہ عرفات، مشعر اور منیٰ کے وقوف و اعمال ہوتے ہیں) حجِ اکبر کہتے ہیں۔

سوال نمبر۶۸ :- فتحِ اکبر کون سا دن ہے؟

جواب : فتحِ مکہ کا دن فتحِ اکبر ہے۔

سوال نمبر۶۹ :- حضرت عیسیٰؑ کے شاگردوں کو کیا کہتے ہیں؟

جواب : حضرت عیسیٰؑ کے شاگردوں کو حواری کہتے ہیں۔ (سورۂ صف ۶۱۔ آیت ۱۴ اور سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۵۲)

سوال نمبر۷۰ :- سورۂ قتال کس سورے کو کہتے ہیں؟

جواب : سورۂ انفال کو سورۂ قتال کہتے ہیں۔

سوال نمبر۷۱ :- اسمائے الٰہی کتنے ہیں؟

جواب : اسمائے الٰہی ننانوے (۹۹) ہیں۔

سوال نمبر۷۲ :- قرآنِ کریم میں کتنے سجدے ہیں؟

جواب : قرآن میں کل ۱۴ سجدے ہیں۔

سوال نمبر۷۳ :- فرعون کے وزیر کا کیا نام تھا؟

جواب : فرعون کے وزیر کا نام ھامان تھا۔

سوال نمبر۷۴ :- وہ کون سے سورے ہیں جن کا آغاز "الر" سے ہوتا ہے؟

جواب : سورۂ یونس، سورۂ ہود، سورۂ یوسف، سورۂ ابراہیم اور سورۂ حجر کا آغاز "الر" سے ہوتا ہے۔

سوال نمبر۷۵ :- قرآنِ مجید کے ان پانچ سوروں کے نام تحریر کیجئے جو انبیاء کرام کے نام پر ہیں؟

جواب : سورۂ یونس، سورۂ ہود، سورۂ یوسف، سورۂ ابراہیم، اور سورۂ محمد انبیاء کے نام پر ہیں۔

سوال نمبر۷۶ :- قرآنِ کریم کے کس سورے میں کہا گیا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کو نو معجزے عطا کئے ہیں؟

جواب : سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت نمبر۱۰۱ میں کہا گیا ہے۔

سوال نمبر۷۷ :- قرآنِ کریم میں لفظ غروب سورج کے افق میں غائب ہونے کے معنوں میں آیا ہے۔ کس سورے میں؟

جواب : سورۂ طٰہٰ۔ آیت نمبر۱۳۰ میں۔

سوال نمبر۷۸ :- قرآن کے وہ کون سے سورے ہیں جن کا آغاز "یاایھا۔۔۔۔" سے ہوتا ہے۔

جواب : سورۂ نساء، سورۂ مائدہ، سورۂ حج، سورۂ احزاب، سورۂ حجرات، سورۂ ممتحنہ، سورۂ طلاق، سورۂ تحریم، سورۂ مزمل اور سورۂ مدثر کا آغاز "یا ایھا۔۔۔۔" سے ہوا ہے۔

سوال نمبر۷۹ :- جدید سائنسی تحقیقات نے یہ بات دریافت کی ہے کہ کائنات مسلسل وسعت اختیار کر رہی ہے۔ قرآنِ کریم کی وہ کون سی آیت ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

جواب : سورۂ ذاریات کی آیت نمبر۴۷ میں اس بات کی جانب اشارہ موجود ہے۔

سوال نمبر۸۰ :- انسان جب بلندی کی جانب سفر کرتا ہے تو آکسیجن کی کمی کی وجہ سے اس کے تنفس میں تیزی آجاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ تھکاوٹ اور سانس لینے میں گھٹن کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کی کس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

جواب : سورۂ انعام آیت نمبر۱۲۵ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سوال نمبر۸۱ :- زمین پر موجود پہاڑ زمین کی حرکت میں توازن قائم رکھنے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ قرآن کی کس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

جواب : سورۂ انبیاء کی آیت نمبر۳۱ اور سورۂ نباء کی آیت نمبر۷ میں اس جانب

اشارہ موجود ہے۔

سوال نمبر۸۲ :- قرآن میں ایک مقام پر چند شوہروں کو مومن اور ان کی بیویوں کو کافر قرار دیا گیا ہے۔ وہ شوہر اور بیویاں کون ہیں؟

جواب : مومن شوہر حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ ہیں اور کافر بیویاں ان کی ازواج ہیں۔ (سورۂ تحریم ۶۶- آیت ۱۰)

سوال نمبر۸۳ :- وہ کون سے پانچ سورے ہیں جو پہلی بار مکہ میں نازل ہوئے؟

جواب : سورۂ علق، سورۂ قلم، سورۂ مزمل، سورۂ مدثر اور سورۂ محمد وہ پانچ سورے ہیں جو پہلی مرتبہ مکہ میں نازل ہوئے۔

سوال نمبر۸۴ :- وہ کون سے سورے ہیں جن کا آغاز "الم" سے ہوا ہے؟

جواب : سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ عنکبوت، سورۂ روم، سورۂ لقمان اور سورۂ سجدہ کا آغاز "الم" سے ہوا ہے۔

سوال نمبر۸۵ :- حضرت ایوبؑ کا ذکر قرآنِ مجید میں کتنی مرتبہ ہوا ہے؟

جواب : قرآنِ کریم میں حضرت ایوبؑ کا ذکر چار مرتبہ ہوا ہے آیات یہ ہیں۔ سورۂ نساء آیت نمبر۱۶۴، سورۂ انعام آیت نمبر۸۴، سورۂ انبیاء آیت نمبر۸۳، اور سورۂ ص آیت نمبر۴۱۔

سوال نمبر۸۶ :- وہ کون سے سورے ہیں جو "حم" سے شروع ہوتے ہیں؟

جواب : "حم" سے شروع ہونے والے سورے یہ ہیں۔ سورۂ غافر، سورۂ فصلت، سورۂ شوریٰ، سورۂ زخرف، سورۂ دخان، سورۂ جاثیہ اور سورۂ احقاف۔

سوال نمبر۸۷ :- وہ کون سی آیت ہے جس میں عربی کے تمام حروف موجود ہیں؟

جواب : سورۂ فتح کی آخری آیت میں عربی کے تمام حروف موجود ہیں۔

سوال نمبر۸۸ :- حضرت موسیٰؑ نے جب اپنی قوم کے لئے استسقیٰ کیا (پانی طلب کیا) تو حکم ہوا کہ پتھر پر اپنا عصا ماریں۔ جب حضرت موسیٰؑ نے پتھر پر اپنا عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے جاری ہوئے اور اس کے لئے آیت میں لفظ "فانفجر" آیا ہے۔ لیکن دوسری جگہ جب حضرت موسیٰؑ کی قوم نے استسقیٰ کیا (پانی طلب کیا) اور حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ اپنا عصا پتھر پر ماریں۔ اس جگہ آیت میں لفظ "فانبجست" آیا ہے۔ ایک جگہ لفظ "فانفجر" اور دوسری جگہ آیت میں لفظ "فانبجست" نازل ہوا---ایسا کیوں ہے؟

جواب : اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک جگہ ایک چیز خدا سے بلاواسطہ طلب کی گئی اور دوسری جگہ حضرت موسیٰؑ کے توسط سے طلب کی گئی۔

سوال نمبر۸۹ :- سورۂ حج میں حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا کہ آپ اعلان کریں کہ لوگ حج کے لئے آئیں۔ ہر کمزور انسان دور دراز اور گہرائیوں سے حج کے لئے آئے۔ یہاں قرآنِ مجید میں لفظ "عمیق" استعمال ہوا ہے۔ لفظ "عمیق" کیوں استعمال ہوا لفظ "بعید" کیوں نہیں؟

جواب : بعید کا لفظ ہموار سطح کی دوری کے لئے بولا جاتا ہے۔ مکہ کیونکہ مرکزِ زمین ہے اور زمین ہموار نہیں بلکہ گول ہے اس لئے دور دراز علاقوں سے مکہ آنے والے لوگ دراصل نیچے کی طرف دوری سے بھی مکہ آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں "عمیق" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

سوال نمبر۹۰ :- داڑھی کا ذکر قرآنِ مجید کی کس سورے میں آیا ہے؟

جواب : داڑھی کا لفظ سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر۹۴ میں آیا ہے۔ البتہ یہاں اس کا

صرف ذکر ہوا ہے اس کے بارے میں کوئی حکم یہاں مذکور نہیں۔

سوال نمبر۹۱ :- قرآنِ کریم کی کون سی آیت سب سے زیادہ مشہور ہے؟

جواب : آیت الکرسی سب سے زیادہ مشہور آیت ہے۔

سوال نمبر۹۲ :- غزوۂ حنین کا ذکر قرآنِ مجید کی کس آیت میں ہے؟

جواب : سورۂ توبہ کی آیت نمبر۲۵ میں غزوۂ حنین کا ذکر ہے۔

سوال نمبر۹۳ :- قرآنِ مجید کے کس سورے میں مکھی کا ذکر ہے؟

جواب : سورۂ بقرہ کی آیت نمبر۲۶ میں مکھی کا ذکر ہے۔

سوال نمبر۹۴ :- قرآنِ مجید کی کس آیت میں ہے کہ جب بھی تین آدمی سرگوشی میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں تو چوتھا خدا ہوتا ہے؟

جواب : سورۂ مجادلہ کی آیت نمبر۷ میں یہ بات موجود ہے۔

سوال نمبر۹۵ :- وہ کون سے نبی ہیں جو مچھلی کے پیٹ میں رہے اور اس کا ذکر قرآنِ مجید کے کس سورے میں آیا ہے؟

جواب : وہ نبی حضرت یونسؑ ہیں اور قرآن میں اس کا ذکر سورۂ صافات کی آیت نمبر۱۴۲ میں ہوا ہے۔

سوال نمبر۹۶ :- قرآنِ مجید کا سب سے چھوٹا سورہ کون سا ہے؟

جواب : قرآنِ مجید کا سب سے چھوٹا سورہ، سورۂ کوثر ہے۔

سوال نمبر۹۷ :- شیعوں کی سب سے پہلی تفسیرِ قرآن کون سی ہے اور اسے کس نے لکھا ہے؟

جواب : شیعوں کی سب سے پہلی تفسیرِ قرآن تفسیرِ امام حسن عسکری علیہ السلام ہے جو کہ ۲۶۰ ہجری میں لکھی گئی ہے۔

سوال نمبر۹۸ :- قرآنِ کریم میں خداوندِ عالم نے متعدد جگہ اپنی ذات کی قسموں کے علاوہ بہت سی قسمیں کھائیں ہیں۔ بتایئے خدا نے اپنی ذات کے سوا کن کن چیزوں کی قسم کھائی ہیں؟

جواب : خداوندِ عالم نے اپنی ذات کے علاوہ مندرجہ ذیل چیزوں کی قسم کھائی ہے۔

(۱) فرشتوں کی، (۲) انبیاء کی، (۳) قرآن کی، (۴) قیامت کے دن کی، (۵) انسان کے نفس کی، (۶) انسانی ضمیر کی، (۷) دوات کی، (۸) قلم کی، (۹) کتابت کی، (۱۰) لکھی ہوئی کتاب کی، (۱۱) جنگ میں دوڑنے والے گھوڑوں کی، (۱۲) باپ بیٹے کی، (۱۳) آسمان کی، (۱۴) سورج اور اس کی روشنی کی، (۱۵) صبح کی روشنی کی، (۱۶) دن کی روشنی کی، (۱۷) غروبِ آفتاب کی، (۱۸) رات کی تاریکی کی، (۱۹) ستاروں کی، (۲۰) زمین کی، (۲۱) آسمان کی، (۲۲) چاند کی، (۲۳) چلتی ہوئی ہوا کی، (۲۴) بادل کی، (۲۵) مکہ کی، (۲۶) منزلِ وحی کی، (۲۷) بیتِ معمور کی، (۲۸) دریا کی، (۲۹) کشتی کی، (۳۰) تین (انجیر) کی، (۳۱) زیتون کی، (۳۲) عصر کی، (۳۳) شفق کی، (۳۴) وتر کی، (۳۵) تمام ہستی کی، (۳۶) جو کی۔

سوال نمبر۹۹ :- قرآنِ مجید کی تفاسیر کی کتنی اقسام اب تک سامنے آئی ہیں؟

جواب : اب تک تفسیر کی مندرجہ ذیل اقسام سامنے آئی ہیں۔

(۱) - تفسیرِ روائی : یعنی روایت و حدیث کے ذریعہ تفسیر۔

(۲) - تفسیرِ لغوی : قرآن کے معنی کو لغت کے ذریعہ واضح و روشن کرنا۔

(۳) - تفسیرِ عرفانی و باطنی : اسے تفسیر صوفی بھی کہا جاتا ہے۔

(۴) - سائنسی تفسیر۔

(۵) - تفسیرِ تاریخی۔

(۶) - تفسیرِ قرآن بہ قرآن۔

(۷) - تفسیرِ جامع۔

(۸) - تفسیرِ فلسفی۔

(۹) - تفسیرِ موضوعی۔

(۱۰) - تفسیرِ شانِ نزولی۔

(۱۱) - تفسیر بالرائے۔

سوال نمبر۱۰۰ :- قرآنِ کریم میں وہ کون سی آیت ہے جس میں مونث کی پچیس ضمیریں بیان ہوئی ہیں؟

جواب : سورۂ نور کی آیت نمبر۳۱ میں مونث کی پچیس ضمیریں بیان ہوئی ہیں۔

سوال نمبر۱۰۱ :- قرآنِ کریم میں چھ ایسی ہستیوں کا ذکر ہوا ہے جو خود بھی نبی ہیں اور ان کے باپ بھی نبی ہیں۔ وہ کون سی ہستیاں ہیں؟

جواب : وہ ہستیاں حضرت اسماعیلؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت سلیمانؑ کی ہیں۔

سوال نمبر۱۰۲ :- قرآنِ مجید کا وہ کون سا سورہ ہے جس کا آغاز ایک میوے کے نام سے ہوا ہے؟

جواب : سورہ التین (انجیر)۔

سوال نمبر۱۰۳ :- قرآنِ مجید کے وہ کون سے سات سورے ہیں جن میں آیاتِ سجدہ ہیں؟

جواب : سورۂ اعراف، سورۂ رعد، سورۂ نمل، سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ مریم، سورۂ حج اور سورۂ فرقان۔

سوال نمبر۱۰۴ :- قرآنِ مجید کا وہ کون سا سورہ ہے جس میں خداوندِ عالم نے نوعِ بشر کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے؟

جواب : سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ میں۔

سوال نمبر۱۰۵ :- قرآنِ کریم میں ثقلان کا ذکر ہے ثقلان سے کیا مراد ہے؟

جواب : ثقلان سے مراد جن و انس ہیں۔ (سورہ رحمٰن ۵۵- آیت ۳۱)

سوال نمبر۱۰۶ :- قرآنِ کریم کی وہ کون سی آیت ہے جس میں لفظ "فِیْہِ" متصل دو مرتبہ آیا ہے؟

جواب : سورۂ توبہ کی آیت نمبر۱۰۸ میں۔

سوال نمبر۱۰۷ :- حضرت عیسیٰؑ کا ذکر قرآنِ کریم میں کتنی بار آیا ہے؟

جواب : قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کا ذکر پچیس مرتبہ آیا ہے۔

سوال نمبر۱۰۸ :- قرآنِ کریم کے وہ کون سے تین سورے ہیں جن میں حضرت یوسفؑ کا ذکر ہوا ہے؟

جواب : سورۂ یوسف، سورۂ انعام اور سورۂ غافر میں حضرت یوسفؑ کا ذکر ہوا ہے۔

سوال نمبر۱۰۹ :- قرآنِ مجید کے کتنے سوروں کا آغاز ایک حرف سے ہوا ہے؟

جواب : تین سوروں کا آغاز ایک حرف سے ہوا ہے۔

ہماری مطبوعات

درسِ قرآن
مکتبِ تشیع اور قرآن
اسرارِ نہج البلاغہ
نہج البلاغہ سے چند منتخب نصیحتیں
مذہبِ اہلِ بیتؑ
شیعیت کا آغاز کب اور کیسے
فلسفۂ امامت
اہلِ بیتؑ آیتِ تطہیر کی روشنی میں
ائمہ سیریز (مکمل سیٹ)
سوانح حیات حضرت فاطمۃ الزہراؑ
اہلِ بیتؑ کی زندگی مقاصد کی ہم آہنگی، زمانہ کی نیرنگی
مثالی عزاداری کیسے منائیں؟
آمریت کے خلاف ائمہ طاہرینؑ کی جدوجہد
صدائے حضرت سجادؑ
سوانح حیات حضرت امام حسینؑ
تفسیرِ سیاسی قیامِ امام حسینؑ
ائمہ معصومینؑ کی سیاسی زندگی کا تحقیقی جائزہ
فلسفۂ عزاداری و قیامِ امام حسینؑ
اثباتِ وجودِ خدا
۲۰ جواب
آسان عقائد (دو جلدیں)
تعلیمِ دین سادہ زبان میں (دو جلدیں)
حسینؑ شناسی
انقلابِ حسینؑ پر محققانہ نظر
فکرِ حسینؑ کی الف ب

تفسیرِ عاشورا
عزاداری کیوں؟
عاشورا اور خواتین
پیامِ شہیداں
ہمارا پیام
آزمائش
درسِ انقلاب
اسلامی تحریک قرآن و سنت کی روشنی میں
شناختِ استکبار
عوامی حکومت یا ولایتِ فقیہ
کتاب المومن
خاندان کا اخلاق
ازدواج در اسلام
اسلام میں خواتین کے حقوق
آسان مسائل
عورت پردے کی آغوش میں
اسلامی اتحاد، مسلکِ اہلِ بیتؑ کی روشنی میں
مادیت و کمیونزم
خاک پر سجدہ مقصد، اہمیت، حقیقت
عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز
انسان کے کمال میں اخلاق کا کردار
دعائے افتتاح - دعائے ندبہ
زیارتِ جامعہ
نظامِ مرجعیت شہیدین کی نظر میں
فاطمہ زہراؑ اسلام کی مثالی خاتون

شیعیت کے تعارف

اور اس کی حقانیت کے اثبات پر بے بدیل تالیفات

مذہب اہل بیتؑ

تالیف

آیت اللہ عبد الحسین شرف الدین

دو جید شیعہ اور سنی علماء کے درمیان خطوط کے ذریعہ ہونے والا نہایت شائستہ علمی مناظرہ

کتابی صورت میں

پھر میں ہدایت پا گیا

تالیف

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی

راہ حق کے متلاشی ایک اہل سنت عالم دین کی ایمان افروز خود نوشت

فلسفۂ امامت

تالیف

علامہ محمد مہدی الآصفی

امامت کے موضوع پر ایک جامع تالیف

جس میں

مختلف اسلامی فرقوں کی جانب سے کی جانے والی امامت کی تعریفوں پر تبصرہ کرتے ہوئے شیعی مؤقف کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

شیعیت کا آغاز

— کب اور کیسے —

تالیف

آیت اللہ سید محمد باقر الصدرؒ شہید

شیعیت کب سے ہے اور شیعہ کب وجود میں آئے؟ ان سوالات کے جواب پر مشتمل تاریخی تجزیہ و تحلیل اور استدلال سے پُر ایک بے بہا تالیف

ہو جاؤ سچوں کے ساتھ

تالیف

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی

جس میں مؤلف نے شیعیت کے امتیازات کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان طعن و تشنیع کا بھی مسکت جواب دیا ہے جو شبہوں پر کیے جاتے ہیں

(اہل بیتؑ)

آیۂ تطہیر کی روشنی میں

تالیف

علامہ محمد مہدی الآصفی

اہل بیتؑ سے مراد کون لوگ ہیں؟ آیۂ تطہیر کی روشنی میں تاریخی اسناد اور علمی استدلال کے ذریعہ جائزہ لیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن فہمی، سیرت معصومینؑ، اسلامی اخلاق اور دیگر دینی موضوعات پر مبنی کتب دستیاب ہیں!